سے غفلت نہ کرے، جسم کو اس کا حصّہ ملے، عقل کو اس کا، اخلاق اور تہذیب کو اس کا، اخلاق اور تہذیب کو اس کا ہاتھ، جسم اور سر کو اس کا، قلب، ذوق اور زبان کو اس کا، یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے، کہ ان میں سے ایک یا چند کو تو قرار واقعی اہمیت دی جائے، اور باقی کو مہمل اور بے کار سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔

عملی زندگی

اور

تربیت کی ضرورت و اہمیت!

ماہرین تربیت جس چیز پر سب سے زیادہ سر کھپاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ قوم کے ہر فرد کو وہ مقام اور جگہ ملے، جس کا وہ اپنی اہلیت اور استعداد کی بنا پر مستحق ہے[1]، اُسے ایسا کام دیا جائے، جو اس کی رغبت اور میلان سے مطابقت رکھتا ہو، تاکہ وہ اپنے "عمل" میں کامیاب ہوسکے، جو کام کرے اس میں لذت پائے، اور اس پر فخر کرسکے، لیکن کیا یہ بات آسان ہے کہ ہر شخص کو اس کے امیال و عواطف کے مطابق جادۂ صحیح پر گامزن کردیا جائے، اور ہم اس کے لئے وہ عملی زندگی تیار کردیں، جو اس کی منتظر تھی؟ نہیں یہ مشکل کام ہے، ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ہر شخص کو اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو Cambridge Essays on Education, Ch. X.

میلان کے مطابق دھندے سے لگا دینا ہے، وہ بھی اس طرح کہ اس سے قوم کے مفاد عمومی پر بھی ضرب نہ پڑتی ہو،

بعض ماہرین تربیت و تعلیم کا خیال ہے کہ "ہر آدمی ہر کام کے لئے موزوں ہے" لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی ہر کام کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ہے کہ وہ معرفت کیونکر حاصل کی جائے، جو ہر فرد کے ذوق کے مطابق ہو، لیکن ان نظریات سے بحث کرنے والے لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہر طالب علم کے لئے کام کا انتخاب کیونکر کیا جائے؟ بہت سی صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں تربیت دینے والا نہیں جانتا ان کا مرکز کیا ہے اور انھیں کیونکر ابھارا جاسکتا ہے؟ آپ مدرسہ میں ایسے طلبہ کو دیکھیں گے، جو اپنے سبق اچھی طرح یاد کر لیتے ہیں اپنا کام چستی سے کرتے ہیں، اپنے آپ پر بھروسہ بھی کرتے ہیں۔ جو حکم دیا جاتا ہے، اس کی تعمیل کرتے ہیں، استاد کی ہدایت، اور اشارۂ چشم و ابرو کے منتظر رہتے ہیں، لیکن ایسے طلباء سے کسی سے اگر پوچھئے، زندگی کس طرح گزارو گے؟ کیا کروگے؟ تو وہ بڑی معصومیت اور سادگی سے جواب دے گا، اس بارے میں ماتو میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا، نہ وہ یہ بتا سکے گا، کہ اس کی رغبت اور رجحان کس طرف ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے؟ وہ ہرگز یہ نہیں جانتا کہ اسے علمی کاموں سے دلچسپی ہے یا ادبی کاموں سے

یا ریاضی اور حساب سے؟

راہ عمل! اس کے برعکس کچھ ایسے طلبہ ملیں گے، جو اپنی راہِ عمل متعین کرنے کی استعداد رکھتے ہیں، وہ بتا سکتے ہیں کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟ تمنّا اور رغبت کیا ہے؟ لیکن وہ صفات جوہری سے محروم ہیں، اس لئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں، اور اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں، ایسا وقت جو جوانی کا حاصل ہوتا ہے جس میں آدمی سب کچھ کر سکتا ہے، اس کو ضروری صلاحیتوں سے محرومی کے باعث وہ گنوا بیٹھتے ہیں۔ کبھی وہ انجینیرنگ کالج میں داخلہ لیتے ہیں، حالانکہ وہ اسم ریاضی کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں، کبھی وہ لا کالج میں پہنچ جاتے ہیں، حالانکہ وہ قوت بیان سے محروم ہوتے ہیں، نہ اپنا کیس قابلیت سے پیش کر سکتے ہیں، نہ اپنا بیان صفائی سے قلمبند کر سکتے ہیں، جب وہ لکھتے ہیں تو غلطی کرتے ہیں، تقریر کرتے ہیں۔ تو ہکلانے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو جاتا ہے، اور وہ کچھ نہیں کر پاتے،

ایسے لوگ بھی ملیں گے جو پیشہ کو خاندانی اعتبار سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، باپ وکیل ہے تو صاحبزادے بھی وکیل بننا چاہیں گے۔ باپ ڈاکٹر ہے تو فرزند دلبند بھی، ڈاکٹری کے پیچھے دوڑیں گے، باپ انجینیر ہے تو کیونکر ممکن ہے، بیٹا، انجینیر بننے کی آرزو اپنے دل سے

نکال دے؟ لیکن کیا یہ مناسب ہے کہ طبیعت کو مناسبت ہو یا نہ ہو، مگر، باپ کے نقش قدم یا خاندان کی روایات کی پیروی ضروری کی جائے؟

ماحول اور سماج

ہم مانتے ہیں، ماحول، سماج، اور گھر کا بڑا اثر ہوتا ہے، وراثت بھی اثر سے خالی نہیں ہوتی، یہ بھی صحیح ہے کہ الولد سرّ لابیہ لیکن ہم غلطی کریں گے اگر فرد، اور ذات کے شخصی رجحان اور میلان کو نظر انداز کردیں، اور اس راستہ پر چلنے دیں، جو اسے منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا، یہ وہ منزل ہے جو اس کے لئے کشش نہیں رکھتی، ہاں یہ ضرور ہے یہ منزل اس کے والد کے لئے کچھ معنی رکھتی تھی، یہ صحیح ہے کہ باپ کی قدرۃً یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربوں، اور مشاہدوں سے اپنے بیٹے کو بہرہ ور کرے، اگر وہ پریسین ہے، یا تاجر کتب ہے، یا کسان ہے، یا کاری گر ہے، یا تاجر ہے تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے، کہ اس کا بیٹا اس کا جانشین بن جائے، اور اس بیاد کو اور اونچا کر دے، جو اس نے خود اپنی ساری عمر میں تیار کی ہے، اگر بیٹے کو باپ کے کام سے دلچسپی ہے تو بلاشبہ وہ اپنے باپ کی گوشہ نشینی کے بعد اس کا فوراً جانشین بن جائے گا، اور اس کے تجارب و مشاہدات سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا، لیکن ہر ایک کے لئے یہ ضروری نہیں، بہت سے نوجوان ایسے بھی ہیں جو اس راستے پر چل کر اپنی زندگی تباہ کر لیتے

ہیں، وہ ایسے کام کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، جس سے انھیں طبعی رغبت نہیں ہوتی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مثلاً باپ تاجر ہے، اور وہ خوب کما کھا کر مرگیا، اس کی گدی پر بیٹا بیٹھا، جسے تجارت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ تو چند ہی دنوں میں جمی ہوئی تجارت کو غارت کر کے رکھدے گا، اور ٹکے ٹکے کو محتاج ہو جائے گا، کیونکہ اس میں وہ صلاحیت نہیں جو اس کے باپ میں تھی، اس لئے وہ وقت سے پہلے ماندا ہو جاتا ہے، دوسروں پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے لگتا ہے، اور آخرکار سب کچھ کھو بیٹھتا ہے، پونجی بھی اور تجارت بھی، انجام؟ ناکامی، اور نامرادی!

معلّم کی حالت

جب ہم معلمین پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ کہ ان حضرات کا بڑا طبقہ، نہ تعلیم سے دلچسپی رکھتا ہے، نہ تدریس سے، ان میں سے اکثر نے یہ پیشہ محض ایک روزگار کے طور پر حاصل کیا ہے، انھوں نے انجینئرنگ ڈاکٹری، اور بیرسٹری کا پیشہ دشوار سمجھ کر چھوڑ دیا اور معلمی کا پیشہ آسان سمجھ کر اختیار کر لیا، انھوں نے اپنے فن میں کمال حاصل نہیں کیا، بے دلی کے ساتھ محض ایک ذریعہ روزگار سمجھ کر اختیار کر لیا،

طلبہ کا حال مدرسین سے بدتر ہے، اگر ہر آدمی اپنے صفات عقلی وجسمی کے لحاظ سے اپنا پیشہ منتخب کرے تو وہ خود بھی کامیاب ہو اور قوم کو بھی فائدہ پہنچے

لیکن ، ثانوی مدارس سے فراغت کے بعد ، طالب علم سوچتا ہے کہ اکتساب فن یا حصول علم کا اب وہ جو راستہ اختیار کرے وہ مختصر ترین ہو ، اور فراغت کے فوراً بعد ، اس کا پھل بھی مل جائے ، اگرچہ انھیں عسکری زندگی سے لگاؤ نہیں ہوتا ، فوج میں اندھا دھند ، جو نوجوان بھرتی ہوتے ہیں ، ان کے اس اقدام میں حب وطن کا اتنا جذبہ نہیں ہوتا ، جتنا یہ کہ نفع فوراً ہو اور کسب و اکتساب کی مدت کم سے کم ہو ،

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طالب علم کا ڈاکٹری کی طرف رجحان ہے لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ڈاکٹری کی تحصیل میں مدت زیادہ لگے گی ، تو وہ اس لائن کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے ، جو اگرچہ مختصر ہوتا ہے ، لیکن اس کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا ، طالب علم کو اپنا پیشہ منتخب کرنے کے سلسلہ میں ہمیشہ اپنے امیال و عواطف کا خیال رکھنا چاہئے ، اگرچہ حصول مقصد میں کتنی ہی دیر کیوں نہ لگے ، اور کیسی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں ، تاکہ اپنی استعداد سے وہ خود بھی فائدہ اٹھا سکے ، اور اپنے وطن کو بھی قرار واقعی فائدہ پہنچا سکے اور اگر وہ اپنے ذوق و میل کے خلاف کسی دوسرے کالج کو منتخب کرتا ہے ، تو اگرچہ ممکن ہے وہ امتحان میں کامیاب ہوجائے ، لیکن سود مند نہیں بن سکتا ، کسی کے لئے بھی ، ! اس کی عملی زندگی اکارت جائے گی ، یہ جو صورت نظر آتی ہے ، کہ صاحب نے وکالت کا امتحان پاس

کرلیا، لیکن ایڈیٹری کر رہے ہیں، ڈاکٹری کی کسی نہ کسی طرح ڈگری حاصل کرلی، لیکن حکومت کے سکریٹریٹ میں ملازمت کر رہے ہیں، کامرس کے امتحان میں کامیاب ہو گئے، لیکن کلرکی کر رہے ہیں، یہ اس لئے ہوتا ہے کہ شروع میں بغیر سوچے سمجھے ان کا پیشہ منتخب کرلیا جاتا ہے، اور بعد میں پھر نئے نئے تجربے کئے جاتے ہیں اور ٹھوکریں کھائی جاتی ہیں، طالب علم کو حصول روزگار کے جذبہ سے بلند ہوکر صرف اپنے ذہنی اور طبعی رجحان کے مطابق اپنی منزلِ مقصود متعین کرنی چاہیئے، تاکہ وہ عملی زندگی میں کامیاب ہوسکے، اور اس کی عملی زندگی دوسروں کے لئے، باعث عبرت نہ ہو، بلکہ باعث رشک و تقلید ہو، ہمارے ہاں جو بڑے بڑے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں اس کی وجہ بھی کوتاہی ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ کوئی کامیاب تاجر، شعلہ مقال خطیب، سرنگار، انشا پرداز، ماہر کسان، محنتی مزدور، یکتائے روزگار، نقاش اور مصور بلند پایہ، وکیل، عالم، اور ڈاکٹر نہ پیدا کرسکیں، ضرورت صرف اس کی ہے کہ طلبہ کو اس کی پوری آزادی ہو کہ وہ صرف وہی راستہ اختیار کریں، جو ان کے مزاج اور طبیعت کے موافق ہے۔

بچہ اور زبردستی بچہ کو جبراً مدرسہ میں نہیں داخل کرنا چاہیئے، بلکہ اس میں شوق، اور رغبت پیدا کرنا چاہیئے، جب وہ جوانی کی سرحد میں قدم رکھے اور زندگی کا سب سے کٹھن مورچہ یہی ہوتا ہے،

تو لازم ہے کہ اسے بغیر رہنما کے تنہا نہ چھوڑا جائے،
یہی وقت ہوتا ہے کہ اگر ذرا چوک ہوئی اور وہ ہاتھ سے
گیا، اور پھر وہ کسی طرح قابو میں نہیں آتا، اور اس کی
عملی زندگی رائگاں ہو جاتی ہے، ہر سال اسکولوں اور
کالجوں سے بہت بڑی تعداد طلبہ کی فارغ ہوکر نکلتی ہے۔
تربیت عملی کا صحیح وقت اب شروع ہوتا ہے، اگر صحیح
تربیت کی جائے، تو ان میں سے بہتوں کو ایسا بنایا
جاسکتا ہے کہ وہ علمی طور پر زراعت کریں، منظم طور
پر تجارت کریں، ماہرانہ طور پر صنعت و حرفت کا کام
کریں، لیکن اکثر، عملی تربیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں
لہٰذا، جو کچھ پڑھا ہوتا اور سیکھا ہوتا ہے اُسے بھول جاتے
ہیں، اور وہ ان کے ذرا کام نہیں آتا۔

جنگ عظیم کے اختتام کے بعد ایسے حالات پیش
آئے ہیں، جنھوں نے ہمیں چونکا دیا ہے، اور حالات میں
تیزی کے ساتھ انقلاب پیدا کرکے ہمیں سوچنے اور غور
کرنے پر مجبور کردیا ہے، کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے
کہ ایک شاندار قوم ہونے کے باوجود ہم ایک سوئی تک
نہیں بنا سکتے؟ ہمارے پاس کپڑا بنانے کی کوئی مل نہیں، ہم
شیشہ سازی کے فن تک سے ناواقف ہیں، ہم دوائیں نہیں
بنا سکتے، آلات نہیں تیار کرسکتے، ان تمام چیزوں میں ہم
غیر ممالک کے محتاج ہیں اور صرف اس لئے محتاج ہیں
کہ عملی تربیت سے بے بہرہ ہیں، اگر ہم میں یہ چیز پیدا
ہوجائے تو بڑی آسانی سے ہم اپنے وطن کو خود کفیل بنا سکتے

ہیں۔

ہمارے پاس مدارس کی کمی نہیں، اور اس نعمت پر ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، خدا کرے ان میں اور اضافہ ہو، علم اور تعلیم کی طرف زیادہ سے زیادہ رغبت پیدا ہو، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے، کہ صرف مدرسوں کی کثرت ہی اصل مقصد نہیں ہے، ضرورت اس کی ہے کہ یہ مدرسے طلبہ میں، عملی جوہر پیدا کریں، اور انھیں عملی زندگی کے لئے تیار کریں، معلموں کا فرض ہے کہ دیکھیں ان کی قوم اور وطن کی ضروریات کا تقاضہ کیا ہے؟ اور اور اسی تقاضے کو پیش نظر رکھکر، وہ اپنے تلامذہ کو تیار کریں، سولونؔ[1] کا قول ہے:۔ "دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ قوانین کتنے اچھے ہیں، اور کتنی اچھی طرح ہم ان پر عمل کرسکتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ قوم کے مزاج کے موافق ہوں اور وہ قوم میں انھیں ماننے کی صلاحیت و قبولیت پیدا کردیں!" ہر کام حکومت ہی کا نہیں ہوا کرتا، کچھ ہمارا کام بھی ہے، کچھ ہمارے دولت مندوں کا بھی ہے، ہم کہاں تک اپنا کام کرتے ہیں، ہمارے سرمایہ دار کہاں تک اپنا کام کرتے ہیں، یہ بھی تو سوچنا چاہیئے، اگر ہمارے سرمایہ دار ملیں کھولتے، کارخانے قائم کرتے، تو ہمارے نوجوان تعلیم سے فارغ ہوکر ان کی طرف لپکتے، اپنے روزگار، اور

---

[1] Solon ولادت ۶۳۸ ق۔م۔ وفات ۵۵۸ ق۔م، قدیم۔ اثینیا کا استاد قانون،

قوم کے لئے، ضرورت کی چیزیں پیدا کرتے، اور اس طرح ان کی عملی زندگی کامیاب تر ہو جاتی،

عقل اور زندگی!

بہت دنوں کی بات ہے، انگلستان کے کابینۂ وزارت کے ایک رکن نے اپنے ملک کے دولت مندوں کو للکارتے ہوئے کہا تھا:-

ہمارے دولت مندوں کے جسم توانا ہیں، عقل منظم اور مرتب ہے، با ایں ہمہ ان کی زندگی یکسر جمود اور تعطل ہے، وہ اپنے اوقات بیکار ضائع کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ دنیا کے سامنے اپنے عمل نافع کا کوئی نمونہ پیش کریں وہ اپنا وقت سیر سپاٹے میں صرف کرتے ہیں، اور جو کچھ کر سکتے ہیں وہ نہیں کرتے، حالانکہ وہ اپنی دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہیں[1]۔

ہمارے دولت مندوں کا آج بھی یہی عالم ہے، ان کی زندگی معطل ہے، اور وہ اپنی صلاحیتوں سے قوم اور ملک کو فائدہ نہیں پہونچاتے، نہ وہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے، دن کو سوتے ہیں اور رات کو سرگشتا کرتے ہیں، اپنی دولت پر گھمنڈ ہے، نہیں جانتے کہ قوم کو ان کی ضرورت ہے، ان کے روپے کی بھی اور خود ان کی بھی، وہ ان کے علم کی محتاج ہے اگر وہ عالم

---

[1] ملاحظہ ہو: Cambridge Essays on Education

ہوں، ان کی رائے کی محتاج ہے اگر وہ مدیر ہوں، ان کے ادب کی محتاج ہے اگر وہ ادیب ہوں، قوم ہر فرد سے خواہ وہ کسی طبقہ سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو، کچھ توقعات رکھتی ہے، اور انھیں بہر حال پورا ہونا چاہیئے خواہ وہ غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، ہر دولت مند ناکارہ ہو یہ بھی نہیں ہے، ان میں ایسے بھی ملیں گے، جو بات کے دھنی ہیں، ایسے بھی ہیں جو کردار کے اونچے ہیں، اپنے علم اور عمل میں دیانت دار بھی ہیں لیکن سست اور کاہل ہیں، اپنے وجود اور قوم کے مفاد سے غافل اور بے خبر ہیں، ترقی یافتہ قوموں اور ملتوں میں کوئی شخص بھی بیکار اور کاہل نہیں ملے گا، سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں،

عملی تربیت! عملی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ بچوں کو شروع ہی سے کسی خاص ڈھرے پر نہ لگا دیا جائے، بلکہ، آغاز میں زور صرف ان کی نشوونما پر دیا جائے، انھیں بتایا جائے کہ کس طرح پڑھیں؟ کس طرح باتیں کریں؟ کس طرح سوچیں؟ کس طرح علم کو عمل سے مربوط کریں؟ اور کس طرح زندگی بسر کریں؟ ۱۶ - ۱۷ برس کی عمر تک لڑکے کو عام تعلیم دینا چاہیئے اس کے بعد اسے موقع دینا چاہیئے کہ وہ اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق اپنے لئے کوئی کام پسند کرے بعض ابا اپنی مالی کمزوریوں کے باعث یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم کا نتیجہ روزگار کی صورت میں فوراً ظاہر ہو جائے، وہ اسے

بھول جاتے ہیں کہ تربیت کی مثال کھیتی کی سی ہے، پہلے زمین ہموار کیجئے، پھر بیج ڈالئے، پھر سیراب کیجئے، تب فصل کاٹئے۔ یہی مرحلے، لڑکے کی زندگی میں بھی پیش آتے ہیں، ان سے گزرے بغیر چارہ نہیں،

گھر، مدرسہ، اور سوسائٹی میں طلبہ کی تربیت اس طرح ہونی چاہیئے، کہ وہ ایک نظام کے خوگر ہو جائیں، حسن معاملت ان کا جوہر بن جائے، فرض کے ادا کرنے کا احساس ترقی کر جائے، جماعت کے ساتھ تعاون کرنے کی عادت پڑ جائے، مصائب کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہو، اپنی ذات اور اپنی کارکردگی پر اعتماد ہو، یہاں تک کہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں، اپنی عقل سے کام لے سکیں، اپنے ہاتھ سے بوجھ اٹھا سکیں، اپنی عملی زندگی میں کامیاب ہوں، اپنے اپنے خاندان، اور اپنے وطن کے کام آئیں، ان کی رائے پختہ ہو، ان کا عمل پختہ ہو،

تربیت خلقی

اور

اس کے محرّکات و عوامل!

مارٹن لوتھر[1] مشہور جرمن معلّم کا قول ہے :- "کسی قوم کی کامیابی اور سربلندی کا راز یہ نہیں ہے کہ اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس کے قلعے کتنے مضبوط ہیں؟ بلکہ اس کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس قوم کے بیٹے علم اور اخلاق کی تربیت سے کس حد تک بہرہ ور ہیں؟"
مانٹ[2] جرمنی کے مشہور فلسفی کا قول ہے کہ :- "ارادہ

---

[1] Martin Luther ولادت ۱۴۸۳ء
وفات ۱۵۳۶ء، سولہویں صدی عیسوی کا مشہور مذہبی معلّم۔

[2] Iammanuel Kant جرمن فلسفی
ولادت ۱۷۲۴ء، وفات ۱۸۰۴ء۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اسکاٹ لینڈ کا تھا!

اور اخلاق میں بڑا گہرا تعلق ہے، اگر ارادہ اچھا ہے تو اخلاق لازمی طور پر اچھا ہوگا، اور اگر ارادہ نا درست ہے تو اخلاق بھی درست نہیں ہو سکتا،!

لیکن ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اطفال کے طبائع، اور میلانات میں اختلاف ہوتا ہے، اگر ان کے اخلاق پر نظر ڈالی جائے تو بعض کھرے، اور سخت نظر آئیں گے، بعض، شرمیلے ہوں گے، کسی میں سخاوت ہوگی، کسی میں بخل، کوئی رحم دل ہوگا، کوئی سنگدل فرق طبائع کا فرق ہے، یہ سب ایک درجہ میں نہیں رکھے جاسکتے، ان میں نیک بد، شریف، شریر، سب ہی قسم کے ہیں، اگر ان کی تربیت نہ ہو، یا ناقص ہو، تو یہ سب کے سب تباہ ہو جائیں گے، ماں باپ کا خاص طور پر فرض ہے کہ وہ بچہ کی اخلاقی تربیت کو کسی وقت بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں، کیونکہ قومیں دولت و ثروت، قلعے، اور چوکی سے نہیں بنا کرتیں، وہ بنتی ہیں علم اور اخلاق سے، شوقی بک نے کیا خوب کہا ہے،

"کسی قوم کا اگر اخلاق خراب ہے۔ تو وہ جڑ نہیں پکڑ سکتی،!"

تربیت خلقی کا مقصد!

تربیت خلقی کا مقصد حسنِ سلوک اور حسن اخلاق ہے، زندگی کے ہر دور میں اور ہر مرحلہ پر، خواہ وہ گھر ہو، مدرسہ ہو، لیبارٹری ہو، سوسائٹی ہو، کچھ ہو، اور یہ مقصد اس وقت تک نہیں حاصل کیا جاسکتا، جب تک بچہ میں یہ

تمیز نہ پیدا ہو جائے کہ وہ برائی اور اچھائی ، خوب و زشت میں پرکھ کر سکے ،

جان لوک کے اصول!

انگلستان کے مشہور ماہر فن تربیت و اخلاق ، اور فلسفہ و مذہب

جان لوک[1] نے حسب اہمیت چند اصول اس سلسلہ میں ترتیب دئے ہیں اور علم کو سب سے اخیر میں رکھا ہے۔

پستالوزی[2] کا کہنا ہے کہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے جو نا معلوم ہے وہ معلوم ہو جائے ، بلکہ یہ ہے کہ آداب ، اخلاق ، اور حسن معاملت کا جوہر پیدا ہو جائے

فروبل نے اپنی کتاب "تربیت انسانی" (Education of man) میں لکھا ہے کہ تربیت کا مقصد اچھی زندگی کا پیدا کرنا ہے ، جو پاک ہو ، اور مقدس ہو ، جس میں اخلاص ہو اور پاکیزگی ہو۔

ہربرٹ اسپنسر[3] کہتا ہے کہ تربیت کا جزوی و کلی مقصد یہ ہے کہ انسان میں "فضیلت" پیدا ہو جائے۔

مدرس کو چاہیئے ، کہ وہ ہمیشہ یہ یاد رکھے کہ ہمارے

---

[1] ۔ Jhon Lock ولادت ۱۶۳۲ء وفات ۱۷۰۳ء
مشہور ماہر تعلیم وتربیت و اخلاق ۔

[2] ۔ Peste Lozzi زیورچ میں پیدا ہوا ولادت ۱۷۳۶ء
وفات ۱۸۲۷ء

[3] ۔ Herbert Spencer ۔ فلسفۂ تربیت و اخلاق کا ماہر خصوصی ۔

لئے صرف علم ہی کافی نہیں ہے، علم سے زیادہ ہمیں اخلاق کی ضرورت ہے، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ طب اور اخلاق دونوں کا یہ اصول بنیادی طور پر ایک ہے،

تربیت خلقی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تلمیذ کے سامنے ہم اخلاق کے فضائل و مناقب پر دھواں دھار لیکچر دے ڈالیں، اور اس کی برائی کے خلاف، ایک زور دار تقریر کردیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ تلمیذ کے دل میں ایسے تاثرات رچ جائیں کہ وہ خود اخلاق کی اہمیت محسوس کرنے لگے، یہ کام مدرسہ کے درجہ میں، کھیل کے میدان میں ہر جگہ ہو سکتا ہے، اخلاق کی تربیت میں عملی نمونہ بہت کام دیتا ہے،

افلاطون سے سوال!

ایک مرتبہ افلاطون[1] سے پوچھا گیا کیا تم "فضیلت" کی تعلیم دے سکتے ہو؟ اس نے جواب دیا، نہیں!، اس انکار کا مقصد یہ تھا کہ فضیلت یعنی تربیت اخلاق پڑھی نہیں جاتی، حاصل کی جاتی ہے، عمل سے اور ارادہ کی پختگی سے بشرطیکہ طبیعت اس طرف مائل ہو، ارادہ، عقل اور رجحان کا مکمل تعاون حاصل ہو،

---

[1] ۔ افلاطون ۴۲۷ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۴۷ ق م وفات پائی، یہ سقراط کا شاگرد تھا، اس کی کتابوں میں "جمہوریت" اور "قانون" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ایک اور فلسفی سے بالکل یہی سوال کیا گیا۔ اس نے کہا: ہاں میں فضیلت کی تعلیم دے سکتا ہوں، اس کی اس بات کا مقصد یہ تھا کہ بعض لوگ اپنی ناواقفیت سے غلطی کرتے ہیں، وہ ایک برا کام کرتے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہ بُرا ہے، ایسے لوگوں کو فضیلت یعنی پاکیزگی، اخلاق کی تعلیم دی جاسکتی ہے، لیکن یہ اس وقت ہو سکتا ہے، جب طبیعت میں اصلاح قبول کرنے کا مادّہ اور رجحان ہو، طبیب اسی وقت دوا دے گا، جب دیکھ لے گا، ہاں مرض ہے، سمجھدار ماں بچّہ کو اسی وقت کھانا دے گی، جب دیکھ لے گی، ہاں اسے واقعی بھوک لگی ہے، ہر مدرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ علوم کے ساتھ ساتھ اخلاق کا بھی معلم ہو،

تربیت اخلاق پر دین اسلام نے بہت زور دیا ہے، اور اس کی اہمیت کو پورے طور پہ محسوس کیا ہے، اللہ نے اپنے نبی کریمؐ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے، "وانک لعلیٰ خلق عظیم"! خود سرورِ کائنات کا ارشاد ہے "ادبنی ربی فاحسن تادیبی وامرنی بمکارم الاخلاق"

ہمارا یہ مستحکم عقیدہ ہے کہ عہد حاضر میں سب سے زیادہ توجہ طلب جو چیز ہے وہ یہی اخلاق ہے، اس کے نظر انداز کردینے کے بعد، کچھ بھی نہیں رہ جاتا، بغیر اس کے نہ فرد بن سکتا ہے، نہ قوم،

مہذب[۵] آدمی! | سوال کیا جاسکتا ہے، مہذب آدمی کی

The Gentleman - ۵

پہچان کیا ہے ؟ اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے وہ شخص جو غم عظیم سے زیادہ متاثر نہ ہوتا، جو دوسروں کے راحت و آرام کا خیال رکھتا ہو، بات کی جائے تو غور سے سنے، کسی حادثہ سے دل خستہ نہ ہو، جس سے دشمنی ہو اس کا لاگو نہ ہو جائے، جب مشورہ لیا جائے، صحیح مشورہ دے، جس میں شرافت اور نزاکت احساس کا مادہ ہو، جو اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے نہ ملاتا ہو، نہ چغل خور ہو، نہ بکواس کا عادی، بس وہی مہذب آدمی ہے،

مہذب آدمی، عدل و انصاف کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا شر کی طرف کبھی مائل نہیں ہوتا، نہ محبت میں مبالغہ کرتا ہے، نہ دشمنی میں انتہا کو پہنچتا ہے، ممکن نہیں کہ وہ برائیوں کا ذکر کرے، اور اچھائیوں کو بھول جائے، وہ کسی پر حسد نہیں کرتا، ناگوار باتوں کو گوارا کرلیتا ہے، غم کی پروا نہیں کرتا کہ اس سے کسی کو مفر نہیں، موت سے گھبراتا نہیں کہ وہ بہر حال آنی ہے،

ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے شاگردوں، اور بچوں کو، مہذب بنائیں، افراد کو اگر ہم مہذب بنالیں، ان کی خلقی تربیت صحیح اصولوں پر کریں، ان میں اخلاق فاضلہ پیدا کریں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے پوری سوسائٹی کو مہذب بنالیا، اور اس میں ہمت کی بلندی، خیر سے رغبت اور شر سے نفرت، ارادہ اور عمل کی قوت، فکر و نظر کی وسعت، قلب کی پاکیزگی، حسن معاملت

غرض تمام اچھی اور صالح باتیں پیدا کردیں،

مشہور فلسفی، جان ڈیوی[1] نے اپنی کتاب "جمہوریت اور تربیت" میں لکھا ہے: "عقل اور اخلاق میں ہم وعظ و پند سے اصلاح نہیں کرسکتے، یہ اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک صناعی اور سیاسی احوال میں تغیر نہ کردیا جائے!" اپنی ایک دوسری کتاب "اخلاق" میں اس نے لکھا ہے، "اخلاق ان مختلف رغبتوں کا مجموعہ ہے، جو انسان کی طبیعت بن جاتی ہیں، اور اُسے کسی کام کے کرنے پر ابھارتی ہیں!" ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اخلاق ان میلانات کا نام ہے، جو سوسائٹی کی تحسین و تکمیل میں مدد گار ہوتے ہیں،

اخلاق کی تکوین!

اخلاق ایک ایسی چیز ہے جس کی تکوین و تعمیر ماں کی گود سے لے کر آغوش قبرستان تک جاری رہتی ہے، بچپن، جوانی، بڑھاپا، ہر دور میں اس کے صورت پذیر ہونے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، یوں سمجھنا چاہیئے، انسان جب تک زندہ ہے اس کی تربیت بھی ہوسکتی ہے، اور تعلیم بھی، زندگی کے ان مختلف ادوار میں سب سے کڑا اور کٹھن دور بچپن اور جوانی کا ہے، اس دور میں اچھی یا بری عادتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں، اور پھر ان میں تبدیلی بہت مشکل سے ہوتی ہے،

---

[1] Jhon Dewey امریکی فلسفی عصر حاضر کا مانا ہوا، ماہر فلسفۂ تربیت و اخلاق، متعدد بیش بہا کتابوں کا مصنف،

تربیت خلقی

اور

اس کے اساسی و بنیادی عوامل !

خلقی تربیت کے بنیادی عوامل حسب ذیل ہیں :-

گھر یہیں سے اخلاق کا اٹھان شروع ہوتا ہے ، یہیں اخلاق کی بنیاد پڑتی ہے ، اگر بنیاد مضبوط ہے تو عمارت ضرور مضبوط ہوگی ، جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ گھر کی تربیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی ، وہ مغالطہ میں مبتلا ہیں ، نہیں جانتے کہ بچہ بڑا نقال ہوتا ہے ، جو کچھ دیکھتا ہے اس کی نقل کرنے لگتا ہے ، سب سے پہلے وہ ماں باپ اور بھائی بہن کو دیکھتا ہے ، اور بڑی آسانی سے ان کا چلن اختیار کرلیتا ہے ، یہ لوگ اگر اچھی باتیں ، اور اچھے کام کرتے ہیں ، تو بچہ بھی ویسا ہی بن جاتا ہے ، ورنہ برعکس ، اگر گالم گلوچ سنے گا ، تو خود بھی گالیاں بکنے لگے گا ، میل محبت کی باتیں دیکھے گا ، تو خود بھی یہی کرنے لگے گا ، لڑتے جھگڑتے دیکھا ، تو خود بھی دنگئی

اور لڑاکو بن جائے گا، غرض وہ اچھی یا بری جس قسم کی تربیت خلقی حاصل کرے گا، اس کا پہلا مرکز گھر ہی ہوگا،

مدرسہ! بچہ جب مدرسہ جاتا ہے، تو کبھی کبھی اخلاقی جراثیم اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے، اور مدرسہ ان چیزوں پر چنداں توجہ نہیں کرتا، اور مدرسین کو اس کے سوا، کوئی فکر نہیں ہوتی کہ بچہ کسی طرح امتحان میں کامیاب ہو جائے اور اخلاق؟ سو اس کی ان کے نزدیک کوئی خاص منزلت نہیں وہ اگر اخلاق میں کبھی دیکھتے ہیں تو اس کے درست کرنے کا انھیں خیال بھی نہیں آتا،

مدرس اگر چاہے تو وہ اوقات درس میں بھی بچوں کے اخلاق کی نگرانی اور اصلاح کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ اس کا فرض ہے، اس سلسلہ میں جو کوتاہی اس کی ذمہ داری جتنی مدرسہ اور مدرس پر ہوتی ہے، بالکل اتنی ہی والدین اور گھر پر بھی ہوتی ہے، جب تک دونوں میں تعاون نہ ہو خلقی تربیت مکمل نہیں ہو سکتی،

کھیل کا میدان! ایک لائق اور ذہین مدرس کے لئے کھیل کا میدان بچوں کی بہترین تربیت گاہ بن سکتا ہے، اسکولوں اور کالجوں سے طلبہ اکسکرشن پر جو جاتے ہیں، یہ تربیت خلقی کا بہترین وسیلہ ہے، لوگ یہ تو مانتے ہیں کہ کھیل کا میدان جسم کی بہترین تربیت گاہ ہے، لیکن یہ نہیں مانتے کہ یہاں اخلاق بھی بنائے جا سکتے ہیں، یہ ان کی غلط فہمی ہے،

ہمارا خیال ہے کہ کھیل کے میدان کودنے کے بعد بچّہ بہت کچھ سیکھتا ہے، صبر استقامت، تحمل میں برداشت، رفاقت تعاون بے غرضی، اطاعت، ضبط و نظم، یہ سب چیزیں جتنے بہتر طور پر کھیل کے میدان میں حاصل ہوتی ہیں، کہیں اور نہیں حاصل کی جاسکتیں،

سوسائٹی! سوسائٹی، ماحول اور حلقۂ احباب کا بھی، اخلاق کی تعمیر و تکوین پر بہت گہرا، اور اچھا اثر پڑتا ہے، اگر سوسائٹی اچھی ہے، تو بچّہ کے اخلاق پر اچھا اثر پڑے گا، اگر بری ہے، تو پھر کسی طرح بھی بچّہ اچھا نہیں رہ سکتا،

اخلاق کی تربیت کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو بات ذہن نشین کرنی چاہئے وہ یہ ہے کہ اخلاق کی تربیت زیادہ کارآمد اور موثر بچپن ہی میں ہوتی ہے، جوں، جوں بڑھتا جائے گا، اس کی عادتیں جڑ پکڑتی جائیں گی، پھر انہیں توڑنا یا موڑنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، معلم کو متعلم کے دل میں یہ بات بٹھا دینی چاہئیے کہ حسن اخلاق ہی، کامیابی اور کامرانی کا واحد ذریعہ ہے اور وہ زندگی کسی کام کی نہیں، جو اخلاق فاضلہ سے خالی اور عاری ہو،

اَخلاق
کے
فطری انفعالات اور تاثیرات!

ڈیکارٹ[1] نے عالم کی دو قسمیں کی ہیں،

(۱) عالم مادی،

(۲) عالم رُوحی،

اس تعلیم سے اندازہ ہوتا ہے کہ غایت اور وسیلہ، اسباب اور نتائج میں تناقض ہوتا رہتا ہے، اور یہ تناقض اسی تقسیم (روحی) (مادی) کا نتیجہ ہے۔

اخلاق اور عمل جان ڈیوی کا خیال ہے کہ اخلاق، ایک نفسی اور داخلی اَمر ہے، یہی انسان کو عمل کے لئے ابھارتا ہے اور آمادہ کرتا ہے، عمل ہی کا دوسرا نام سلوک ہے، پس ثابت ہوا انسان کا اخلاق وہی

---

[1] Rene Descartes
۱۵۹۶ء ۱۶۵۰ء، فرانس کا مشہور فلسفی ارتقائے فکر، اور فلسفۂ جدیدہ کا علمبردار،

ہے جو سوسائٹی اور عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہے، اگر آپ کسی انسان کو دیکھیں گے تو اخلاق سے پہلے اس کے عمل پر نظر پڑے گی، زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے اخلاق، سلوک (عمل) پر اثر انداز ہوتا ہے، لہذا، اخلاق سبب ہے، اور سلوک یا عمل، سبب یا نتیجہ ہے،!

سلوک (عمل) درحقیقت اخلاق کا جز ہے، بلکہ اسے سر تاپا اخلاق بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی اخلاق و سلوک درحقیقت ایک مسمّی کے دو نام ہیں،

بچّہ میں فطری انفعالات اور تاثرات کے ماتحت چند چیزیں پیدا ہوتی ہیں، وہ لڑتا ہے، اس کے چہرے پر غصّہ کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں، کوئی گیند کھیلنے سے منع کرے تو اس سے جھگڑ پڑتا ہے، یہ سب باتیں اسی وقت رونما ہوتی ہیں جب انفعال و تاثر پوری شدت کے ساتھ کار فرما ہوں، اس وقت وہ انجام پر نظر نہیں کرتا، بچّہ کی تربیت اخلاق و عمل میں عادات فطری کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اور اس کو اسی وقت قابو میں لایا جاسکتا ہے، جب تربیت صحیح اصولوں پر ہو،

انسان انفعال و تاثر کے عالم میں بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، جن کا نتیجہ ندامت اور شرمندگی کی صورت میں رونما ہوتا ہے، کیونکہ ایسے وہ جو کچھ کرتا ہے جذبات کے ماتحت کرتا ہے، عقل سے متاثر ہوکر نہیں، لہذا جو کچھ اس سے سرزد ہوتا ہے، بلا سوچے سمجھے، اور اگر وہ کرنے سے پہلے سوچ سکے، تو غلطی نہ کرے، اور

ندامت کا موقع نہ حاصل ہو، اور اگر انسان ایسا کر سکے، تو بہت سے مواقع پر اُسے ندامت اور شرمندگی سے نجات مل جائے،

انسان کو غصّہ اسی وقت آتا ہے، جب وہ کوئی صدمہ یا اذیت محسوس کرتا ہے، جیسے زخمی شیر، وہ لکڑی اور پتھر بلکہ اپنا زخم تک غصّہ میں چبا ڈالتا ہے، کتّے کے آگے سے ہڈی اٹھالی جائے، بھنبھوڑ کھائے گا، بچّہ سے کھیل چھین لیا جائے، مچل جائے گا، مصنف کی کتاب پر اگر تنگ نظری، حسد، یا جہل کے ماتحت نقد و تبصرہ کیا جائے، تو وہ جلبلا جائے گا!

عمل پر وجدان کا اثر!

بعض علمائے علم النفس کا خیال ہے کہ عمل کی بنیاد وجدان ہے یہی وہ قوی ترین شعور ہے، جو انسان کو خیال سے عمل کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے، لیکن ان علماء علم النفس نے فکر و ارادہ کی قوت کو نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ ان دونوں کا بھی عمل پر براہِ راست بہت گہرا اثر پڑتا ہے!

اور سچی بات تو یہ ہے کہ عمل فکر و ارادہ دونوں کا محتاج ہے، وجدان، فکر و ارادہ کے درمیان رابطہ کا کام دیتا ہے۔

ہم مانتے ہیں وجدان عمل پر اثرانداز ہوتا ہے، لیکن ہم اسے نہیں مانتے کہ سلوک (عمل) تمام تر وجدان ہی کا نتیجہ ہوتا ہے،

عمل کے بارے میں کانٹ[1] کی رائے

کانٹ کا خیال ہے کہ

[1] Immanuel Kant -

سلوک کی اساس و بنیاد ارادہ ہے، انسان کے سامنے ایک ہی وقت میں دو غور طلب باتیں آتی ہیں، وہ دونوں پر غور کرتا ہے، دونوں کے نتائج سوچتا ہے۔ اور پھر کوئی ایک پہلو لے کر عمل کے لئے کھڑا ہوتا ہے، لہذا ثابت ہوا کہ یہ عمل ارادہ کا نتیجہ ہے، ایک سگریٹ نوش اپنی صحت پر، سگریٹ نوشی کا برا اثر محسوس کرتا ہے، سوچتا ہے کہ اسے چھوڑ دینا چاہئے، پھر چھوڑ دیتا ہے، یہ ترک ارادہ کے سوا کس کا نتیجہ ہے؟

ہم ارادہ کی اثر انگیزی کے منکر نہیں ہیں، لیکن صرف اسی کو اصل اور اساس نہیں قرار دیتے، جس طرح عمل پر ارادہ کا اثر پڑتا ہے، فکر اور وجدان کا بھی پڑتا ہے، ارادہ صرف ایک وسیلہ ہے، ہمارا خیال ہے حسنِ اخلاق نتیجہ ہوتا ہے، ارادہ کی اچھائی کا، لیکن ارادہ کی اچھائی، حسن اخلاق کو مستلزم نہیں ہوتی، بہت سی ایسی خطائیں بھی ہیں جو انسان ارادہ، اور نیت کی اچھائی کے ساتھ کر گزرتا ہے، کیا ہم نیت اور ارادہ کی اچھائی کے سبب ایک میرے کام کو اچھا سمجھ لیں گے؟ لہذا، نہ ہم کانٹ کے اس قول کو مانتے ہیں کہ ارادہ ہی عمل کی بنیاد ہے، نہ ہم ڈی کارٹ کے اس اصول کے قائل ہیں کہ وجدان ہی عمل کا محرک ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اخلاق کی بنیاد، فکر، وجدان، اور ارادہ تینوں پر ہے انسان کی حیات نفسی کے یہ تینوں مظاہر ہیں،!

عمل کی بنیاد: فکر

بعض قدیم فلاسفہ کا خیال ہے کہ فضیلت کا دوسرا نام عقل ہے، اور رذیلت

کا دوسرا نام جہل ہے، انسان سے کبھی غلطی ہو جاتی ہے، اور وہ رذیل حرکت کر بیٹھتا ہے، یہ غلطی ناسمجھی کا نتیجہ ہوتی ہے، لہٰذا عمل (سلوک) اور اخلاق کی اصل بنیاد عقل ہے، سقراط کا خیال ہے کہ انسان سے جب غلطی ہوتی ہے، اور وہ کسی رذیل حرکت کا ارتکاب کرتا ہے، تو اس کا سبب جہالت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، ایک دوسرے فلسفی کا خیال ہے کہ فکر، ذکاوت، اور عقل، بھی فضائل کاملہ کی بنیاد ہیں۔ کیونکہ انسان سے کوئی رذیل حرکت اس وقت تک سرزد نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی طبیعت کو مطلق العنان نہ چھوڑ دے اور عقل و فکر کی طرف سے منہ نہ موڑے، اس رائے کو اگر مانا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خلق کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک قدرت کی طرف سے ذکاوت اور عقل بہت زیادہ نہ ملی ہو، لیکن کیا یہ بات صحیح ہے؟ کیا یہ بات سچ ہے کہ صاحب فکر و ذکاوت طبقہ کے سوا، اخلاق کہیں نہیں ملتا؟ کیا یہ بات درست ہے کہ ایک عالم آدمی جو جو فلسفہ، طبیعیات، کیمیا وغیرہ کی الف بے بھی نہیں جانتا، اخلاق سے محروم ہوتا ہے؟

ہم مانتے ہیں کہ علم فضیلت کے دروازے کھول دیتا ہے، بشرطیکہ طبعی میلان بھی اس طرف ہو، وعظ و پند کا اثر صرف صالح طبائع ہی پر ہوتا ہے، وہ عالم جو علم کے ساتھ اخلاق فاضلہ سے بہرہ ور ہو، اس جاہل سے بہتر ہے، جو صرف صاحب اخلاق ہے، لیکن ہم اُسے تسلیم نہیں کر سکتے کہ علم فضیلت کو مستلزم ہے، اور ذکاوت حسن اخلاق کو

مستلزم ہے ، تکوینِ اخلاق کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم فلاسفہ ، علما ، اور مناطقہ کا درجہ ، علم ، فلسفہ اور منطق میں حاصل کریں ، ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ سلوک صرف معرفت ہی پر منحصر ہے ، یا فکر سلوک کی بنیاد ہے ، بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ، حسن اخلاق اور حسنِ سلوک کے لئے فکر ، وجدان ، اور ارادہ تینوں چیزیں ضروری ہیں ،

تربیت کے وسائط

خاندان اور سوسائٹی کا اثر تربیت پر!

گزشتہ صفحات میں کسی مقام پر ہم بحث کر چکے ہیں کہ سوسائٹی اور ماحول کا اثر انسان کی فکر، عمل اور اخلاق پر کتنا گہرا ہوتا ہے۔ ایک بچہ اگر کسی گویّے کے گھر پیدا ہوگا، تو عام طور پر یقیناً اُسے موسیقی سے زیادہ رغبت ہوگی۔ ایک ڈاکٹر کے لڑکے سے پُوچھئے میاں آئندہ زندگی میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ اکثر و بیشتر اس کا جواب یہی ہوگا "میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں"۔ ۱۰۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کے اخبار "ڈیلی میل (لندن) Daily mail کی اشاعت میں میں نے ایک خبر پڑھی تھی کہ "برمنگھم یونیورسٹی کی ایک طالبہ برقی انجینیرنگ کے امتحان میں سب سے اوّل آئی۔ اس شعبہ کے صدر نے لڑکی کے بارے میں کہا۔ کہ یہ لڑکی تمام طلبہ پر اپنی قوّتِ فکر قوّتِ عمل اور قوّتِ بحث کے لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے۔ یہ ایک انجنیر خاندان کی لڑکی ہے۔ اور اسی سال اس کے چچازاد بھائی نے بھی اسی مضمون میں ایسی ہی کامیابی ایک دُوسری یونیورسٹی سے حاصل

کی ہے - ان دونوں کا یہ میلان، خاندان کی تربیت اور خاندانی سوسائٹی کے اثر کا نتیجہ تھا - خاندانی سوسائٹی کا اثر بالکل غیر شعوری طور پر پڑتا ہے۔ اور بڑا گہرا ہوتا ہے - سوسائٹی سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، اور اس کا اثر بالکل مخفی ہوتا ہے

بچّہ کی سوسائٹی

اگر بچّہ ایسے ماحول اور سوسائٹی میں بسر کرے، جہاں اس کی تربیتِ فکر کے پورے سامان موجود ہوں - اس کے ذوق کو مکمل کیا جائے - مدرسہ اچھا ہو، تصویریں خوب ہوں - باغ اور چمن ہو، جس میں کھیلنے کودنے کی اجازت ہو - اچھے اچھے لیکچر اور عمدہ عمدہ گانے سننے کو ملتے ہوں - اور اگر کہیں ان چیزوں کے ساتھ ایسی ماں بھی ملی ہو، جو تربیتِ اطفال کے فن سے واقف ہو، جو اس کی تربیت کا پورا خیال رکھتی ہو، وقتِ معینہ پر کھانا دیتی ہو - صاف اور دھلے ہوئے کپڑے پہناتی ہو - اور باپ اس کے معاملاتِ فہم و خرد میں اس کی مدد کرنے پر تیار رہتا ہو اس میں اعتمادِ نفس کا جوہر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہو، جو اُسے کھیلنے بھی دیتا ہو - اور تربیت سے بھی غافل نہ ہو - کوئی شبہ نہیں، ایسا لڑکا ذہنی اور دماغی اور جسمی اعتبار سے اس لڑکے سے کہیں زیادہ بلند اور ممتاز ہوگا - جو روکھی سوکھی کھاتا ہے - اور جسے صرف ستر پوشی کے برابر لباس میسّر

ہے ، جس کے ماں باپ کو تربیت اور پرداخت کی فرصت نہیں ملتی ۔ ایسے غریب لڑکے کو فطرت کی طرف سے جو ذکاوت اور ذہانت ملی ہوگی وہ رائگاں جائے گی ۔ اس سے وہ قطعاً کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکے گا ؛

خانگی تربیت کی اہمیت

گھر کا اثر انسان پر بہت زیادہ پڑتا ہے ۔ بالخصوص معاملاتِ ذیل میں :-

(۱) زبان ، لہجہ اور طرزِ گفتگو گھر ہی سے حاصل ہوتا ہے ۔ بچہ ماں سے زبان سیکھتا ہے ۔ اگر ماں کی زبان اچھی ہے تو بچہ کی بھی ہوگی ۔ نوکروں کے میل جول اور دُوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل کُود میں اگر زبان کچھ خراب بھی ہوگی ، تو ماں اُسے پھر ٹھیک کردے گی ۔ رفتہ رفتہ وہ غلط زبان کے استعمال سے اجتناب کرنے لگے گا زبان جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں تخاطب اور تفہیم کا بہترین ذریعہ ہے ۔ اس کے ذریعے علوم و معارف ، ایک سے دُوسرے کی طرف منتقل ہوتے ہیں ۔ تبادلۂ افکار کے لئے اس سے بہتر کوئی دُوسرا وسیلہ اور ذریعہ نہیں ؛

(۲) آداب ، معاملات اور احوال میں بھی گھر کا بڑا حصّہ ہوتا ہے ، اسے بہت بڑا درجہ حاصل ہے ۔ آدابِ عالیہ گھر ہی میں بنتے اور پیدا ہوتے ہیں ۔ انسان

اپنے گھر کا آئینہ ہے۔ جو کچھ گھر ہوگا، وہ اس کے چہرے سے آشکارا ہوگا۔ آداب نتیجہ ہوتے ہیں، نمونہ اور مثال کا۔ بچّہ کے سامنے جیسا نمونہ ہوگا، جیسی مثال ہوگی، ویسے ہی اس کے آداب ڈھلیں گے۔ بچّہ سے اکثر ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جن کا ادراک اسے نہیں ہوتا۔ اس کے منہ سے اکثر ایسے الفاظ نکلتے ہیں جن کا مفہوم وہ نہیں جانتا۔ اب یہ ماں کا کام ہے کہ اس کے کام میں اور الفاظ میں معنی اور مفہوم پیدا کردے۔ اسے صحیح راستے پر لگادے اور غلط الفاظ کے استعمال سے روک دے۔

انسان کے اخلاق و عمل پر گھر کے بعد جس چیز کا سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے، وہ سوسائٹی ہے۔ اگر یہ اثر اچھا ہے تو اس کی رُوح ظاہر ہو جائے۔ لیکن گھر سے باہر جب دُوسروں سے خلا ملا کا موقع مِلتا ہے، اور وہ حُسنِ اخلاق سے محروم ہوتے ہیں تو وہ پھر گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کی طاہر رُوح پھر گندی ہو جاتی ہے۔ باپ کا فرض ہے کہ وہ بیٹے کو، وہ اپنی اولاد کو دُنیا کے اسرار و رموز سے آشنا کرے۔ باپ کا فرض ہے کہ وہ بیٹے کا سچّا اور واقعی دوست بن

جائے۔ اپنے تجربات اور مشاہدات سے اسے محروم نہ رکھے۔ تاکہ بچہ، نہ سوسائٹی کا غلط اثر قبول کر سکے، نہ گھر کا۔ بلکہ خود ہی اس میں یہ مادہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار کی اچھی تربیت کے بعد نگہداشت اور حفاظت کر سکے۔ اسی طرح ماں کو بیٹی کی سچی اور مخلص سہیلی بن جانا چاہیئے۔ وہ بیٹی کے بارے میں جو کچھ چاہتی ہے کہ وہ یہ کرے اور وہ نہ کرے سب کچھ بتا دے۔ تاکہ کوئی اسے غلط راستے پر نہ ڈال سکے ٭

(۳) ذوقِ فنی اور جمالِ طبیعی پر بھی گھر اثر کرتا ہے۔ بچہ کی نظر سے اگر وہ اچھے اور شائستہ گھر میں ہو، اچھے مناظر گزرتے ہیں۔ خوب صورت تصویریں گزرتی ہیں۔ آنکھوں کو پسند آنے والے مجسمے گزرتے ہیں۔ انہی چیزوں سے ذوق اور فن سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے ٭

گہرا اثر مختصر الفاظ میں اگر ہم اپنا مفہوم بیان کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ انسان کے اخلاق، عادات، زبان اور ذوق پر سب سے زیادہ اثر گھر کا پڑتا ہے۔ البتہ اگر گھر اچھا ہو اور سوسائٹی خراب ہو تو گھر کی حاصل کی ہوئی تربیت غارت ہو جاتی ہے ٭

اگر یہ دیکھا جائے۔ کہ گھر میں بچہ کی صحیح اور

مکمل تربیت نہیں ہو سکتی ۔ تو ضروری ہے ۔ کہ اس
کے لئے اچھی سوسائٹی پیدا کی جائے ۔ اس سے
گھر کا کام لیا جاسکتا ہے ۔ وہ ایسی تربیت پر
قادر ہے جو گھر میں ممکن نہیں ۔ اب سوال پیدا
ہو سکتا ہے کہ وہ کون سی سوسائٹی ہے جو گھر کی
قائم مقام بن سکتی ہے ؟ ہمارا جواب ہے ' مدرسہ!

مدرسہ!

اور اس کے فرائض و واجبات

مدرسہ تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس کا ایک خاص دستور ہے، ایک خاص نظام ہے مدرسہ کا مقصدِ قیام ہی یہ ہے کہ وہ انسانی سوسائٹی کو درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ صحیح تربیت کرے۔ اور اچھی تعلیم دے۔ اور سوسائٹی کے افراد کو، سوسائٹی کے لئے نافع اور مفید بنا دے۔ تربیت جس طرح فرد کی ہوتی ہے، اسی طرح قوم کی بھی ہوتی ہے۔ روسو کا قول ہے "بچہ کو صرف بچہ کی مصلحت کا خیال کر کے تعلیم دی جانی چاہیئے!" ہمیں اس قول سے شدید اختلاف ہے۔ ضروری ہے کہ اس تعلیم میں قوم اور سوسائٹی کا بھی حصہ ہو۔ جو آج بچہ ہے، کل وہ جوان بنے گا۔ یعنی قوم کا ایک عضو یعنی سوسائٹی کا ایک عنصر۔ پھر اگر یہ عنصر ناتمام ہے۔ یہ عضو ناقص ہے تو قوم بھی لنڈوری رہ جائے گی۔ اور سوسائٹی بھی پھل پھول نہیں سکے گی۔ قوم افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ لہذا قوم کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ مدرسے اچھے ہوں۔ اور

وہاں تربیت و تعلیم کا معقول انتظام ہو ۔

مدرسہ کی حیثیت

مدرس اور طلبہ بدلتے رہتے ہیں لیکن مدرسہ جوں کا توں قائم رہتا ہے ۔ وہ ایک ٹھوس اور مستقل چیز ہے ۔ وہیں عقل و رُوح ، ذہن و دماغ اور جسم و بدن کی تربیت ہوتی ہے ۔ اور یہ تربیت تا زندگی قائم اور باقی رہتی ہے ۔ مدرسہ کے معنی یہ ہیں کہ بچہ ایک چھوٹے گھر سے ایک بڑے گھر میں آگیا ۔ وہاں کے مقابلے میں یہاں بھائی بہن زیادہ ہیں ۔ جو اس کے کھیل، عمل علم ، مدرسہ کی زندگی کے ہر دَور میں برابر کے ساتھی ہوتے ہیں ، جو اس کی مسرت میں حصہ لیتے ہیں ۔ جلسوں اور مناظروں میں شریک ہوتے ہیں ۔ اس طرح مدرس کی صورت میں ایک اور شفیق باپ مل جاتا ہے ، جو اسے پڑھاتا ہے ، کھلاتا ہے ۔ نصیحت کے موقع پر نصیحت کرتا ہے ۔ وعظ کے موقع پر وعظ وہ اسے بتاتا ہے مفید کیا ہے اور مضر کیا ؟ کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ اسے حل کرتا ہے ، کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے ، کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ اس کی تصحیح کر دیتا ہے ۔ وہ اس کے سامنے ایک نیا راستہ کھول دیتا ہے ، وہ اسے فرض شناسی سکھاتا ہے ۔ وہ اسے برداشت اور تحمل کا درس دیتا ہے ۔ مدرس کی کئی حیثیتیں ہوتی ہیں ۔ وہ ایک شفیق باپ ہوتا ہے ۔

ایک لائق ساتھی ہوتا ہے، سچا دوست ہوتا ہے۔ دور اندیش رہنما ہوتا ہے ؎

مدرس کا کام بھی نہیں ہوتا کہ وہ پڑھا لکھا دے سوسائٹی اور قوم کے لئے فرد کو مفید اور کارآمد بنانے کا کام مدرس ہی کرتا ہے۔ قوم کو، اور والدین کو مدرسہ سے جو توقعات ہوتی ہیں وہ اس وقت تک پوری نہیں ہوسکتیں جب تک ہم مدرسہ کو ایسے مدرس نہ مہیا کریں جنہیں تعلیم سے واقعی دلچسپی ہو، جو تدریس سے ذوق رکھتے ہوں، جو بچوں کی نفسیات سے واقف ہوں، اور فنِ تربیت کے جدید اصولوں سے آشنا ہوں۔ مدرسہ کا بھی صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ تعلیم پر اکتفا کرے۔ اس کا فرض ہے کہ گھر میں جو کسر رہ گئی ہے اسے پورا کرے۔ مدرس اگر فرض شناس ہے تو اس کی ڈیوٹی آسان نہیں بڑی کٹھن ہے۔ اس کا فرض ہے کہ بچّہ کے جسم کی نگہداشت کرے۔ تاکہ وہ مضبوط اور توانا ہو۔ ہاتھوں کی تربیت کرے۔ تاکہ وہ کام کرسکیں اور اچھی طرح کرسکیں۔ عقل اور فکر کی تربیت کرے۔ تاکہ ان سے صحیح کام لیا جاسکے۔ قلب اور آنکھ کی تربیت کرے۔ تاکہ وہ نیکی کی طرف راغب ہو۔ اور جمالِ قدرت کا مشاہدہ کرے۔ کان کی تربیت کرے تاکہ وہ اچھّی آواز سُنیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے اسے انجام دینے میں بڑی بڑی دشواریوں سے لازمی

طور پر سابقہ پڑے گا - اور ان دشواریوں سے صرف اخلاص اور دیانت اور صداقت کے بل پر عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے - بغیر اس کے یہ منزل سر نہیں کی جا سکتی ؛

مدرسہ اور تعاون

مدرسہ کی زندگی کا دار و مدار تمام تر، تعاون و اشتراکِ عمل ہی پر ہے - اسی طرح وہ ترقی کی منزلیں طے کر سکتا ہے - اور عروج کی سیڑھیاں چڑھ سکتا ہے - مدرسہ کی زندگی کے لئے تعاون اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی کھیت کے لئے پانی ؛

مدرسہ ایک جسم ہے - اور جسم کی طرح اس کے چند اعضا ہیں - اور ہر عضو کا ایک خاص فریضہ ہے مدرسہ کا مہتمم عضوِ مسئول ہے - جس پر ہر قسم کی جواب دہی ہے - مدرّس عضوِ عامل ہے جو اس کے چلانے کا ذمہ دار ہے - باپ بھی ایک ضروری عضو ہے - اور تلامذہ ایسے اعضا ہیں جو زیرِ نمو ہیں - مدرّس باپ سے نہیں کہہ سکتا، تم غیر ضروری ہو - باپ مدرّس سے یہ نہیں کہہ سکتا - مدرسہ ایسے اعضا کا مجموعہ ہے کہ اگر ایک عضو کو درد محسوس ہوگا، تو سب ہی تڑپیں گے - مدرسہ اگر ناکام ہے تو خوب معلوم کر لیجئے - اس ناکامی کی وجہ عدم تعاون کے سوا کچھ نہیں ہے ؛

تعاون ہی مدرسہ کی اصل روح اور زندگی ہے -

اگر گھر، مدرسہ، وزارتِ تعلیم اور وزارتِ مال میں مدرسہ کی ترقی، تنظیم، تکمیل وغیرہ کے سلسلے میں مکمل تعاون اس طرح نہ ہو کہ نشستیں آرام دہ ہوں، درجے کشادہ ہوں، کتابیں کافی ہوں تو مدرسہ کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکے گا ٭

مدرسہ اور اس کے فرائض بچّوں اور لڑکیوں کی تربیت کے سلسلہ میں قوموں اور ملتوں کو سب سے زیادہ بھروسہ اپنے مدرسوں اور مکتبوں پر ہوتا ہے۔ مدرسہ ان گتھیوں کو سلجھاتا، اور ان کوتاہیوں کو پورا کرتا ہے جو گھر اور سوسائٹی کے بس میں نہیں ہوتیں۔ زبان اگر خراب ہے۔ اخلاق اگر پست ہے، عادت اگر خراب ہے تو یہ سب مدرسہ ہی کو ٹھیک کرنا ہیں ٭

مدرسہ فضیلت کا منبع ہوتا ہے۔ اخلاقِ کریمہ کا مصدر ہوتا ہے۔ طہارۃ اور کمال کا وسیلہ ہوتا ہے اگر کسی مدرسہ میں علم و عمل کا کمال نہیں حاصل ہوتا جسم و عقل کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اخلاق، رُوح اور وجدان تربیت نہیں پاتے۔ تو ہم اُس مدرسہ کو کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ اسے فرض شناس نہیں قرار دے سکتے ٭

مدرسہ کا فرض ہے کہ وہ ایسے افراد تیّار کرے جو اجتماعی امور میں مفید ہوں۔ مہذب اور شائستہ ہوں۔ جماعت کے دُکھ پر جن کا دِل کڑھتا ہو۔ انسانیت

عامہ سے جنہیں محبت ہو۔ اپنی قوم کے فدائی ہوں مغربی، مشرقی کو، سفید کالے کو، ہر تعصب سے آزاد ہوکر اپنا بھائی سمجھتا ہو۔ اور اسے انسانیت کے دائرہ میں پوری مساوات دیتا ہو ؏

قیصر ولیم کی رائے! سابق قیصر ولیم نے ۱۸۹۰ء میں معلمین کے ایک بڑے اجتماع کے سامنے تعلیم عالی کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا:- "ضروری ہے کہ تعلیم کی بنیاد وطنی ہو۔ ضروری ہے کہ تعلیم کی بنیاد جرمنی ہو۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان یونانی یا لاطینی کی بجائے خالص جرمنی بنیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس اصول سے دست کش ہوجائیں، جس پر صدیوں سے عمل ہو رہا ہے۔ اگرچہ لاطینی اور یونانی زبانیں کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتی ہوں، اور انہیں کیسا ہی مقام کیوں نہ حاصل ہو۔ لیکن اگر یہ زبانیں ہماری قوم کی مصلحت کے مطابق نہیں ہیں جس کے ہم امین ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ سب کو بھول کر ہم جرمنی زبان ہی کو بنیاد اور اساس تعلیم و تعلّم کی قرار دے لیں اور جرمنی ادب کو ہر چیز پر مقدم قرار دے لیں۔"

اگر سابق قیصر جرمنی کی اس رائے کو ہم تسلیم کرلیں کہ تعلیم کی اساس قومی اور وطنی ہونی چاہیئے۔ اور یہ کہ ساری توجہ ملکی زبان ہی پر صرف کرنی

مدرسہ!

اور زندگی پر اس کا اثر!

تربیتِ حیات، اور تربیتِ کتبی میں بہت بڑا فرق ہے تربیتِ حیات عبارت ہوتی ہے تجارب سے، دُوسروں کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے، اور اشتراک و تعاون کرنے سے۔ کام میں اور کھیل میں حصّہ لینے سے۔ اور تربیتِ کتبی وہ چیز ہے، جو مدرسہ کو بچّہ کی نشوونما میں مساعد بناتی ہے۔ پہلی صورت میں انسان دُوسروں سے حاصل کرتا ہے، اور یہ بے مقصد ہوتی ہے۔ یعنی انسان دُوسرے کے ساتھ رہ کر، جو کچھ حاصل کرتا ہے، اور غیر شعوری طور پر سیکھتا ہے اس میں مقصد کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ تجربے بغیر مقصد کے حاصل ہو جاتے ہیں۔ ماہرینِ اقتصادیات و سیاسیات کے ساتھ جس کی نشست و برخاست ہوگی، ضرور اُس کے تجربے اور معلومات میں اضافہ ہوگا۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نشست برخاست کا مقصد سیاسی اور اقتصادی معلومات حاصل کرنا تھا۔ یہ جو کچھ حاصل ہوا اس کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن بے مقصد حاصل ہوا۔ اس کے برعکس اگر آدمی فقط کوئی جماعت (مثلاً مدرسہ) اپنے لئے منتخب کرتا ہے، یا

کسی پارٹی میں شریک ہوتا ہے تو اس جماعت یا پارٹی سے جو استفادہ ہوتا ہے وہ متعدی ہوتا ہے۔ اگر جماعت صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو استفادہ بھی صحیح ہوگا۔ ورنہ بصورتِ دیگر معاملہ برعکس ہوگا۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس شخص کے ساتھ معاشرت رکھے۔ اسے پہلے سے جانچ اور پرکھ لے۔ اسی طرح جس جماعت کو چُنے، اس کے بارے میں پہلے سے ضروری معلومات حاصل کرلے۔ کیونکہ ہر ساتھی ایک دُوسرے کی کسی نہ کسی درجہ میں پیروی ضرور کرتا ہے۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ یہ بات آدمی کے بس میں ہے کہ وہ اپنی عقل کو مضبوط بنائے، اور نفس میں استحکام پیدا کرے۔ تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہ وہ خود اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ صالح (اچھے) کو اختیار کرے۔ اور طالح (بُرے) کو ترک کردے۔ لیکن یہ بات، بچہ کے لئے نہیں کہی جاسکتی۔ اس لئے کہ نہ اس کا نفس مستحکم ہوتا ہے، نہ عقل۔ اس کے عمل اور فعل کا دار و مدار، صرف نقالی پر ہوتا ہے۔ جو دیکھتا ہے وہ کرتا ہے، جو سُنتا ہے وہ مانتا ہے وہ نفع نقصان کو نہیں دیکھتا۔ مستقبل پر اس کی نظر نہیں ہوتی۔

انسان اور تجربہ

لیکن کیا انسان کے لئے وہ تجارب کافی ہیں جو وُہ دُوسروں کے ساتھ رہ کر حاصل کرتا ہے؟ کوئی شبہ نہیں یہ تجارب بڑے قیمتی اور اہم ہوتے ہیں۔

ضرورت محسوس کرتی ہیں ۔ اس کے برعکس متمدّن اقوام تعلیم پر پُوری توجہ کرتی ہیں ۔ مدارس کا قیام ان کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے ۔ وہ بے دریغ اس کام پر روپیہ خرچ کرتی ہیں ۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جس طرح انسانی زندگی کے لئے پانی اور ہَوا ضروری ہے ، بالکل اسی طرح قوموں اور ملّتوں کی زندگی کے لئے مدرسوں کا قیام ضروری ہے ۔ علم زندگی ہے اور جہل کی زندگی مَوت سے بدتر ۔

وحشی قومیں ، اپنی زندگی میں ان معلوماتِ اوّلیہ پر بھروسہ کرتی ہیں جو باپ دادا سے وراثتہً منقول ہوتے چلے آئے ہیں ۔ لیکن یہ زندگی کے لئے کافی نہیں ہیں ۔ اور اگر آپ کو ہمارے اس خیال کی صداقت میں شبہ ہے تو ایک نظر کسی جاہل پر اور ایک نظر کسی عالم پر ڈال کر دیکھ لیجئے ۔ خود ہی سب کچھ معلوم ہوجائے گا ۔ آپ کو اندازہ ہوگا ۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے ۔ پہلے کا شمار انسانوں میں ہوتا ہے ، اور دُوسرے کا حیوانوں میں ۔ وحشی قوم کا ایک بچّہ ، کوئی مدرسہ نہیں پاتا ، جہاں وہ تعلیم و تربیت حاصل کرے ۔ وہ صرف اپنی زندگی میں اس عِلم پر بھروسہ کرتا ہے ، جو اس نے اپنے سماج سے حاصل کیا ہے ۔ وہ اپنے بڑوں کی ہر معاملہ میں پیروی کرتا ہے ، اور ایسی زندگی بسر کرتا ہے ، جو انسانیت کے معیار پر پُوری نہیں اُترتی ۔

عمل اور ایجاد کے لئے نقالی بیکار ہے۔ اس کے لئے تعلیم، مشق اور جد و جہد ضروری ہے۔ اور یہ کام بغیر مدرسہ کے نہیں انجام پا سکتا، اور مدرسہ بغیر ایسے لوگوں کے کامیاب نہیں ہو سکتا جو علم و عمل کے ماہر ہوں۔ تاکہ وہ اپنے شاگردوں کو عمل کا صحیح راستہ دکھا سکیں۔

سوسائٹی کی طلب

سوسائٹی جن چیزوں کی جویا ہے ان کی تعلیم بغیر مدرسہ کے نہیں ہو سکتی۔ وہاں ایسی چیزوں کی تعلیم بآسانی ممکن ہے، جن کی تعلیم خارج میں نہیں مل سکتی۔ ہم مانتے ہیں صناعات اولیہ اور علم ابجدی کا درس مدرسہ کے باہر بھی لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ترقی یافتہ صنعتیں اور وہ علوم جو درایت اور تجربہ، بحث و مناظرہ، کتب اور حوالہ جات کے بغیر نہیں آ سکتے۔ ظاہر ہے، ان کی تعلیم صرف مدرسہ ہی میں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مدرسہ بہترین تعلیم گاہ ہے مدرسہ میں شاگرد کو پڑھنے کا وقت بھی ملتا ہے، سیکھنے کا بھی۔ مشق اور تجربہ کا بھی، نظریات و خیالات کو پرکھنے کا بھی۔ یہ چیزیں بغیر مدرسہ کے کسی طرح بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔

تربیتِ جدیدہ کا مطالبہ مدرس اور مدرسہ سے یہ ہے کہ تربیت سطحی نہ ہو، عملی ہو۔ یوں سمجھنا چاہیئے مدرسہ عالم اکبر کے مقابلہ میں ایک عالم اصغر ہے۔

یہاں زندگی اور دُنیا کی ہر چیز ممثّل ہو کر نظر آتی ہے.
اگر اس اسلوب پر تربیت نہ ہوئی تو بچہ جب باہر نکلے گا تو وہ اپنے تئیں ایک ایسی دُنیا میں پائے گا۔ جو اس کے لئے بالکل نئی ہوگی۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اب وُہ کیا کرے؟ کس طرح زندگی بسر کرے؟

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہ کہ زندگی عمل کی محتاج ہے۔ وہی اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اگر حیاتِ انسانی کے لئے غذا ضروری ہے تو تربیت بھی بسا ضروری ہے۔ تربیت حیاتِ ذاتی اور حیاتِ اجتماعی دونوں کے لئے یکساں ضروری اور لابدی ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مدرسہ بڑی دُنیا کے مقابلہ میں ایک چھوٹی دُنیا ہوتا ہے!

مدرسہ : ایک سوسائٹی

مدرسہ اپنی ذات کے اعتبار سے بجائے خود، ایک چھوٹی موٹی سوسائٹی ہے۔ اس سے بہتر ذریعہ اور وسیلہ، تلامیذ کی تربیتِ اجتماعی کا کوئی دُوسرا نہیں مہیا ہوسکتا۔ مدرسہ ہی کی زندگی وہ سچی زندگی ہے جو گھر اور سوسائٹی کو ایک بنا دیتی ہے۔ اور افراد کو سوسائٹی کا مفید عنصر بنا دیتی ہے، خواہ طبقات اور ماحول کا کتنا اور کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔

مکتبی سوسائٹی

مکتبی سوسائٹی میں تلمیذ جان لیتا ہے کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرے؟ دُوسروں کے ساتھ کیسا سلوک کرے؟ غیروں کے ساتھ کیونکر تعاون کرے؟ دُوسرے کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ پڑوسی کے حقوق کیونکر ادا کرے؟ اپنے معاملات میں۔ امانت و دیانت کے اصول کی پیروی کس طرح کرے؟ قول کا سچا بن جائے۔ فیصلہ کرے تو عدل کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اجنبیوں پر شفقت کرے۔ اپنے عمل

میں مخلص ہو ، ذمہ داری کا احساس رکھتا ہو۔ اور ضمیر کی رہنمائی قبول کرتا ہو ؟

مدرسہ کی زندگی

مدرسہ کی زندگی ہر روز طلبہ کو ایسے وسائل مہیا کرتی ہے کہ وہ فضائلِ اجتماعیہ سے بہرہ مند ہوں۔ اور ان اجتماعی خصائص کا حسنِ اخلاق و معاملت پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے طلبہ ہمیشہ اس کے محتاج رہتے ہیں کہ ان کی قرار واقعی نگہداشت اور نگرانی کی جائے۔ انہیں وعظ و پند سے محروم نہ رکھا جائے۔ تاکہ مکتبی سوسائٹی کے وہ اچھے رُکن بن سکیں، اور صحیح بنیادوں پر ترقی کرسکیں۔ مدرسہ میں اس کی پوری نگرانی کی جانی چاہیئے کہ تلمیذ جھوٹ کا عادی نہ ہو معاملات میں غلط کار نہ ہو، بدتمیز نہ ہو۔ اس میں پستی اور دناءت کی عادتیں نہ ہوں۔ مدرسہ میں تمام طلبہ کے ساتھ یکساں برتاؤ ہونا چاہیئے۔ چاہے ان میں کوئی فقیر ہو یا امیر۔ بدصورت ہو یا خوب رُو۔ اونچے گھرانے کا ہو، یا نیچے گھرانے کا۔ مدرسہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں جلن اور حسد کا مادّہ نہ پیدا ہونے دے۔ اور ان کے حقوق کا پورا پورا لحاظ اور خیال رکھے۔ ان کی شخصی عادتوں کو سنوارنے میں اجتماعی مصلحتوں کا بھی پورا خیال رکھے۔ جب انہیں تعاون کی

ضرورت محسوس ہو ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کرے
اس طرح مدرسہ اچھی سوسائٹی بن سکتا ہے۔ جس میں
قومیت اور وطنیت کی رُوح اُبھر سکتی ہے۔ اور
اخلاق مکمل ہو سکتے ہیں۔ اور عقل منظم ہو سکتی
ہے۔ اخوت اور مساوات کی رُوح بیدار ہو سکتی ہے
علم و عمل کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اطلاع اور
بحث سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ نظام اور کمال
سے لگاؤ پیدا ہو سکتا ہے ٭

مدرسہ کی حیاتِ اجتماعی

روشن ــــ اور ــــ خوش گوار زندگی

مکتبی زندگی بڑی نفع بخش ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مکتبی سوسائٹی سے بڑھ کر رُوحِ اجتماعی پیدا کرنے والی کوئی دُوسری چیز نہیں۔ یہاں مدّرس طلبہ کو اس سوسائٹی کے لئے تیار کرتا ہے جو اس کی منتظر ہے۔ وہ انہیں سوسائٹی سے اس طرح قریب کر دیتا ہے کہ وہ اس کے لئے اجنبی نہیں رہتے ٭

اچھا مدرّس اچھا مدرّس صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ پڑھا دے۔ وہ قدم قدم پر اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ درس حوادثِ حیات اور حیاتِ ذاتی سے قریب ہو۔ تاکہ آگے چل کر بھی بچّے تنومند اور سلیم العقل نوجوان بن سکیں۔ اپنی روزی آپ کما سکیں۔ اور کامیاب زندگی بسر کر سکیں۔ یہ جان سکیں کہ وطن ان سے کیا چاہتا ہے اور اسے کس طرح پُورا کیا جا سکتا ہے؟ جس سوسائٹی میں رہتے ہیں اس کے احتیاجات سے واقف ہوں ٭

وطنیت، مطالعہ، املا، انشا وغیرہ کے اسباق میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ موضوعات، وقت کے حوادث سے متعلق ہوں، اس طرح مدرسہ اپنے تلامذہ کے اندر صحیح وطنی اور اقتصادی اسپرٹ پیدا کر سکتا ہے۔ سال کے دوران میں متعدد مواقع ایسے آتے ہیں جب ہم اپنے تلامذہ کے اندر صحیح جذبہ اور روح ابھار سکتے ہیں۔ مثلاً یوم میلاد النبیؐ، یومِ آزادی، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، مجالس آئین ساز کے انتخابات، وزیر اعظم یا صدر حکومت کی افتتاحی تقریر، یہ اور اس طرح کے دوسرے مواقع، قومی زندگی کو استوار کرنے، اور وطنیت کی روح بیدار کرنے میں بہت کام دے سکتے ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں طلبہ بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ پوری رغبت اور اشتیاق کے ساتھ!

مدرسہ کی حیاتِ اجتماعی کو کامیاب اور سودمند بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف قِسم کے کھیلوں کا بندوبست کیا جائے۔ دلچسپی اور تفریح کے زیادہ سے زیادہ انتظامات کئے جائیں تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ نشاط اور چستی پیدا ہو، اور وہ اپنی زندگی کو زیادہ بہتر طور پر مرتب اور منظم کر سکیں۔

مدرسہ کی کامیابی

مدرسہ کی کامیابی کے لئے جس طرح مختلف قِسم کے کھیلوں کا انتظام ضروری ہے۔ اسی طرح، مختلف قسم کی جماعتوں

موجودہ زمانہ میں ہم مدرسے سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ایک منظم ادارہ ہو، جہاں تلامیذ ایک نظام کے ساتھ زندگی بسر کرنے ہوں۔ تعلیم کا بھی ایک دستور ہو، اور عمل کا بھی۔ کھیل اور پڑھائی کے درمیان مناسب تقسیم اوقات ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی طلبہ کی نظر ہو۔ مثلاً کمرہ خالی ہے۔ اس وقت کوئی تلمیذ موجود نہیں، تو وہ سوئچ آف کر دے اور خواہ مخواہ بلب کو جلتا چھوڑ کر بجلی اور روپیہ ضائع نہ کرے۔ گھر پر وہ یہی کرتا ہے لیکن مدرسہ میں آکر اس کا چنداں خیال نہیں کرتا۔

گھر کی کوتاہی

مدرسہ ان کوتاہیوں کو بھی پورا کرتا ہے جو گھر میں رہ جاتی ہیں۔ بالخصوص ان بچوں پر اسے خاص توجہ کرنی پڑتی ہے جو غریب گھرانوں کے ہوتے ہیں اور صحیح وسائل تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مدرسہ میں بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ مدرسہ کو اچھا مدرسہ بنانے میں کس طرح جدوجہد کریں۔ اس کے باغیچوں کو کس طرح ٹھیک کریں۔ اس کی روشوں کو کس طرح درست کریں ڈرائے کس طرح سیکھیں؟ کھیل کا میدان کیسے ٹھیک کریں؟ جلسوں کا انتظام کیونکر کریں؟ دسترخوان کس طرح بچھے؟ مہمانوں کا استقبال کس طور سے کیا جائے؟ انہی سب باتوں سے اجتماعی رُوح پیدا ہوتی اور تربیت پاتی ہے ٭

کی سربلندی کے لئے وہ کوشش کرتا ہے ۔ اس سے انتساب پر فخر کرتا ہے ۔ اس کے حقوق اور اپنے فرائض پہچانتا ہے ۔ اس میں ایسی اجتماعی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے جو زندگی بھر ساتھ دیتی ہے ۔ اور وہ ہمیشہ مدرسہ کی محبت اپنے دِل میں موجود پاتا ہے ۔

لیکن یاد رکھنا چاہیئے ۔ مدرسہ کی زندگی کے لئے جتنی مذکورہ سرگرمیاں ضروری ہیں ۔ اُتنی ہی تعلیم بھی ضروری ہے ۔ ترازو کے دونوں پلڑے بالکل یکساں ہوں ۔

گھر، مدرسہ اور کھیل کا میدان

یورپ میں طلبہ کی اخلاقی، عقلی، اجتماعی اور جسمی تربیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اگر ہم آج کے بچّوں پر، اور چالیس برس پہلے کے بچّوں پر ایک نظر ڈالیں تو بہت بڑا فرق، آج اور کل کے چہروں میں نظر آئے گا۔ انگلستان کے بچّے، مجموعی حیثیت سے اس لئے زیادہ تنومند اور شگفتہ ہوتے ہیں کہ شروع ہی سے ان کی کافی غور و پرداخت کی جاتی ہے۔ وہاں بچّہ کی صرف خانگی تربیت ہی کافی نہیں سمجھی جاتی، بلکہ مکتبی تربیت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اور کھیل کے میدان کی تربیت بھی بہت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اور قبل اس کے کہ وہ دُنیا کے میدان میں قدم رکھّے وہ بہت کچھ سیکھ چکتا ہے اور معلوم کر چکتا ہے۔ وہاں کا بچّہ جب پانچ برس کا ہو جاتا ہے تو وہ مدرسۂ ابتدائیہ میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں ماں باپ، بچہ کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ضروری مدد کرتے ہیں۔ اچھی اچھی کہانیاں سُناتے ہیں اور سونے سے پہلے پہلے وُہ کہانی کہانی میں اسے بہت سی ضروری باتیں بتا دیتے ہیں۔ اسے ایسے کھیلوں میں مصروف رکھا جاتا ہے۔

جنہیں ہم تعلیمی کھیل کہہ سکتے ہیں ۔ ان کھیلوں سے وہ اعداد جوڑنے لگتا ہے اور حروفِ ابجدی کی شناخت میں اسے آسانی ہوتی ہے ۔ اشکالِ ہندسی بھی اس کی سمجھ میں آنے لگتی ہیں ۔ مثلث، مربع، مستطیل، دائرہ، نصف دائرہ ـــــ یہ سب چیزیں وُہ کھیل ہی کھیل میں جان لیتا ہے ۔

بچّہ اور کھیل بچّہ کو وہاں ایسے کھیل بھی کِھلائے جاتے ہیں کہ ان میں تکوینی ذوق پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس کو چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز اور سائیکلیں دی جاتی ہیں ۔ انہیں توڑنے پھوڑنے، اور ان سے کھیلنے میں اسے پُرزوں کی ساخت کی پہچان آ جاتی ہے ۔ اور وہ انہیں جوڑنے بھی لگتا ہے ۔ ان بچّوں کو کوئی ایسا کھیل نہیں کِھلایا جاتا، جو ان کے تکوینی یا عملی و علمی ذوق کو نہ اُبھارے ۔ ان کے لئے چھوٹی چھوٹی ریلیں مہیّا کی جاتی ہیں ۔ اس طرح وہ انجن اور ڈبّوں کے متعلق بہت کچھ جان جاتے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ انگلستان کی فضا بھی علمی ہے، اور وہاں کا گھر بھی ۔

(۱) دَورِ طفولیت میں بچّہ کے اطوار و سکنات کی پُوری نگہداشت اصل بنیاد یہی ہے۔ اور اسی پر بچّہ کے مستقبل اور زندگی کا انحصار ہے۔ انگلستان میں دَورِ طفولیت کی تربیت کو اتنا اہم سمجھا جاتا ہے کہ قبل اس کے کہ بچّہ پیدا ہو، وہ اس کی پندرہ برس کی عمر تک کا پروگرام بنا کر اسے سوچنے لگتے ہیں۔ وہاں کا ترقی یافتہ طبقہ جو وراثت کے اثر کا قائل ہے، وہ اور زیادہ احتیاط اور چھان بین سے کام لیتا ہے۔ وہ ہرگز کسی ایسے طبقہ میں شادی نہیں کرے گا، جہاں عقلی یا عصبی امراض پائے جاتے ہوں، ان سے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بچّہ میں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ وہ آگے چل کر کہیں پاگل نہ ہو جائے۔ کہیں سل یا دق کا شکار نہ بن جائے۔

(۲) وہاں بچّہ کو نشو و نما کے سلسلہ میں پُوری آزادی دی جاتی ہے۔ اسے ذرا نہیں چھیڑا جاتا۔ اور اس طرح اس میں اجتماعی حس پیدا کی جاتی ہے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ بچّہ جو کچھ کرے اسے بے چُون و چرا کرنے دیا جائے، لیکن اسے خود سے کام کرنے، اور خود سے تجربہ کرنے کا موقع ضرور دیا جانا چاہیئے۔ ہم دُور سے اس کی نگہداشت کرتے رہیں، یہی ہمارا کام ہے ہمیں چاہیئے کہ اسے اصلاح کا خود موقع دیں۔ اور جب

واقعی وہ ہماری مدد کا محتاج ہو، تب اس کی مدد کریں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اس میں معرفتِ نفس پیدا ہو۔ اپنے شعور و عواطف کو وہ ضبط و نظم کا خوگر بنا سکے ٭

(۳) بچّہ کو ورزشی کھیلوں کا بھی پُورا موقع ملنا چاہیئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ بھی اخلاق و جسم کو سدھارنے کا نہیں ہے۔ ان کھیلوں سے اس میں عمل کا جذبہ تیز ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے ہی لئے نہیں سوچتا، پُوری ٹیم کے لئے سوچتا ہے ٭

(۴) یہ بھی نظر سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔ کہ کبھی کبھی بچّہ خاموشی اور سکوت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے ٭

(۵) مراہقت اور بلوغ کا زمانہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس دَور میں خاص طور پر کڑی نگرانی اور مکمّل نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے ٭

(۶) وہ کام جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ بچّہ کو انہیں کرنے دیا جائے۔ اسی طرح ذہنی عناصر کو تقویت دینے والے فنون سے بھی اسے رغبت دلائی جائے۔ تاکہ اس کا جسمی و عقلی نمو ساتھ ساتھ ہو ٭

(۷) بچہ کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لئے ہر مرحلہ پر گھر اور مدرسہ میں مکمّل تعاون ہونا چاہیئے۔ بغیر اس کے، اس کی پرورش اور پرداخت مکمل نہیں

ہوسکتی اور نہ تربیت کا صحیح مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

متمدن اقوام متمدّن اقوام میں، اور خاص طور پر انگلستان اور امریکہ میں گھر اور مدرسہ کے درمیان کامل طور پر باہمی اعتماد پایا جاتا ہے، ان دونوں میں بڑا گھر اُس کا مدرسہ ہوتا ہے، ان دونوں کے پیش نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ بچّہ کا اٹھان اچھّا ہو، ایسا نہیں ہوتا کہ مدرسہ ایک سرے پر ہو، اور گھر دوسرے سرے پر، اور یہ دونوں مل نہ سکیں، مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں گھر اپنا فرض بالکل ادا نہیں کرتا، صرف مدرسہ ہی کو سارا کام کرنا پڑتا ہے، اپنا بھی اور گھر کا بھی،

اس صورت سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ بچّوں کے ابّا کو، کبھی کبھی مدرسہ میں بلایا جائے، اور بچّہ کی تعلیم و تربیت سے متعلق، ان کے سامنے سارے حالات رکھے جائیں، انھیں صحیح صورت سے باخبر کیا جائے، اور انھیں بتایا جائے کہ مدرسہ کس طرح ان کی تعلیم و تربیت کے مسئلہ میں دلچسپی لے کر انھیں، بلند اور اعلیٰ بنانا چاہتا ہے،

نیویارک میں، مدرسہ، گھر کو اپنے سے قریب رکھنے کی بہت کوشش کرتا ہے، امریکہ میں آبا مدرسہ کے سب سے سرگرم عامل ہیں، وہ ان لیکچروں میں جو عام ہوتے ہیں، جوش و شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ جو ڈیبیٹ ہوتے ہیں ان میں بھی حصّہ لیتے ہیں، غرض مدرسہ کی اجتماعی سرگرمیوں میں جس حد تک بھی انھیں موقع ملتا ہے، وہ

پوری شرکت کرتے ہیں ان کا اور مدرسہ کا نسلی تعلق ہے ، جو ایک خاندان اور اس کے افراد میں ہوتا ہے۔

امریکہ کے مدرسے!

امریکہ میں آبا کی اور تعلیم گاہوں کی، متعدد سوسائیٹیاں قائم ہیں جن میں پورا پورا اشتراک اور ربط ہے ، ان کے جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اہم موضوعات ——— مثلاً ، مدرسہ کے کام ——— مدرسہ کا مقصد ——— بچّہ اور اس کی نفسیات ——— بچّہ اور اس کی تربیت ——— پر لیکچرز دیئے جاتے ہیں ، ان میں ہر دو سوسائیٹیوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں ، اور سچّے دل سے حصّہ لیتے ہیں ، ان میں سے ہر ایک کا مقصد ، بچّے کی صحیح تربیت اور اس کی تکمیل ہے ، انھیں یقین ہے کہ آج کا بچّہ ، کل پورا مرد بنے گا ، اور آج کی تربیت ، پورے طور پر کل ظاہر ہوگی ، آج جو بیج ڈالے جائیں گے۔ کل وہ فصل لائیں گے ، اگر آج ہم بچّوں کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھتے اور صحیح انتظام کرتے ہیں ، گھر میں ، مدرسہ میں ، اور کھیل کے میدان میں انھیں اپنی ذہنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے ، تو مستقبل کے لئے ہم ایک اچھی عقل اور اچھی قوم تیار کر رہے ہیں ،

(۱(Winnetka):- ونٹکا

یورپ کی ایک مثال!

امریکہ میں بچّوں کے جو مدارسے ہیں ، ان میں بچّوں کے داخلہ کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ آیا مدرسہ سے پورا پورا تعاون کریں گے ، اگر

کوئی باپ اس شرط کو نہ قبول کرے، تو مدرسہ میں بچّہ کو نہیں داخل کیا جاتا۔

انگلستان میں بھی، گھر، اور مدرسہ کے درمیان رابطہ قائم کرنے کی بڑی سرگرم کوششیں ایک عرصہ دراز سے جاری ہیں، اور ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک تعلیم و تربیت کے معاملہ میں، مدرسہ کی ہدایت پر صدق دل سے عمل کرتے ہیں، تعلیم گاہوں کی طرف سے موسیقی کے اجتماعات، تھیٹر اور ورزشی کھیلوں کی تقریبات میں آبا کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا ہے، تاکہ وہ دیکھیں ان کے بیٹوں نے موسیقی میں، اداکاری میں ورزش میں کتنی ترقی کی ہے،؟ اور انھیں ان لوگوں سے ملایا جاتا ہے جو مدرسہ کے اہم امور کے انچارج ہوتے ہیں،

انگلستان میں گھر ایک چھوٹا سا مدرسہ ہوتا ہے، وہاں اُسے علمی سوسائٹی اور علمی فضا حاصل ہوتی ہے، ماں تعلیم دیتی ہے، باپ رہنمائی کرتا ہے، نوکر پڑھ کر سناتا ہے، گھر کا ہر فرد صبح سے لے کر شام تک بچّہ کی فکر میں رہتا ہے، صبح کو بچّہ صبح کا اخبار لے کر ماں کے پاس پہنچتا ہے وہ اس میں سے بچوں کے کالم کا حصہ اُسے سناتی ہے، مثلاً ہاتھی، یا چیونٹی کی کوئی بات، پھر وہ اپنے کمرے میں پڑھنے یا کھیلنے چلا جائے گا، چھ بجے شام کو اُسے دودھ کا ایک پیالہ یا شوربہ کا ایک پیالہ دیا جائے گا، رات کو جب وہ بستر پر لیٹے گا، تو اُسے کہانیاں سنائی جائیں گی، یا بچکاتے شعر یا

کوئی اچھا سا گانا ، یہاں تک کہ وہ سو جائے گا ! نئے زمانے کا مدرسہ آبا کا خیر مقدم کرتا ہے ، وہ انھیں بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہر مرحلہ پر خبر دار رکھتا ہے ،

سمجھدار معلّم کا فرض ہے کہ وہ آبا کو اس حقیقت سے آشنا کرے کہ بچّہ کی زندگی صرف اس کے لئے نہیں ہے ، پورے خاندان ، پوری قوم اور پورے ملک کے لئے ہے۔

بچپن اور بچپن کی شکلیں

نفسیاتِ عقلی کے چند اہم پہلو

اِس باب میں، چند اہم اور دُور رس مسائل پر ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں،

بچوں کی تعلیم! بچوں کی تعلیم میں، اگر معلّم، ان کے حالات رجحانات، میلانات، اور نفسیات کا خیال رکھے، تو امید سے زیادہ کامیابی ہوتی ہے، مدرس کو چاہئے کہ وہ اپنے ہر تلمیذ کو اس طرح تعلیم دے گویا وہ اس کی نفسیات سے آشنا ہے، اس کی صلاحیتوں سے واقف ہے، جس سوسائٹی میں وہ رہا ہے اُسے جانتا ہے، جس ماحول میں اس نے پرورش پائی ہے، اُسے پہچانتا ہے، اتنے معلومات حاصل کرنے کے بعد مدرس اس قابل ہوگا کہ وہ اپنے تلمیذ کی شرشت سے اچھی طرح واقف ہو جائے، اور اسے وہ چیزیں بتائے، جنھیں وہ آسانی کے ساتھ ہضم کرے، پھر آسانی کے ساتھ وہ بہت سی غلط، اور نامناسب چیزوں سے بچوں کو دور رکھ سکتا ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ وہ ان کے اخلاق، شخصیت

اور مزاج سے پورے طور پر واقفیت پیدا کرے ان کے جسمی نقائص، اور عقلی کوتاہیاں اس کی نظر میں ہوں، پھر وہ یہ کرے گا، کہ کلاس میں، ہر بچہ کو اس کی مناسبت کے پیش نظر، نشست دے گا، جو بچے کمزور آنکھوں والے اور کوتاہ جسموں والے ہوں گے، انھیں اگلی صف میں بٹھائے گا اور ضعیف العقل لڑکوں کو اس مدرسہ میں یا کلاس میں بھیج دے گا، جہاں ذہنی و دماغی کوتاہیاں زیر تربیت و اصلاح لائی جاتی ہیں۔

مدرس کی استعداد! اگر مدرس، ان حقائق کا درک حاصل کرے، تو وہ ان بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہے گا، جو ان حقائقِ بدیہیہ سے عدم واقفیت کی بنا پر ظہور میں آتی رہتی ہیں، اگر اسے یہ معلوم ہے کہ کھیل، اور حرکت بچہ کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کھانا، اور ہر عقلی کام دماغ کے خلایا میں اپنا ایک اثر قائم کرتا ہے، اور تکان سے انتباہ کی استعداد کم ہو جاتی ہے، اور حافظہ کام نہیں کرتا، تو وہ اپنے ہر درس اور ہر پند میں ان بنیادی حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر آگے بڑھے گا، وہ بچہ کو موقع دے گا کہ وہ کھیل کے وقت ضرور کھیلے، اور پڑھنے کے وقت ضرور پڑھے یہ جان کر کہ سستی اور کاہلی اور تکان کی علامت ہے بچہ کو حسب ضرورت ورزش بھی کرائے گا، اور آرام کا موقعہ بھی دے گا، وہ اس کی کوشش کرے گا کہ بچے ہر وقت چاق چوبند رہیں، صبح کے وقت جیسے تر و تازہ

ہوں، سہ پہر کو بھی ویسے ہی دکھائی دیں، آج کا کام پورا کرنے کے بعد وہ اتنے نہ تھک جائیں کہ کل کے لئے کام کرنے کی سکت ان میں باقی نہ رہ جائے۔ بچّہ سے اگر کوئی خطا ہو جائے، اور وہ خطا نتیجہ ہو ناواقفیت، یا بھول چوک کا، تو تنبیہ کے بعد معاف کر دینا چاہیئے، اور اگر وہ خطا، سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کا نتیجہ ہو، بدنیتی اس میں شامل ہو، تو ایسی سزا بھی دینا چاہیئے، جو جرم کے مطابق ہو، لیکن سزا میں بھی اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس سے طبیعت راستی قبول کرے، اور اصلاح کی طرف مائل ہو۔ بچّہ کے دل میں یہ بات بٹھا دینی چاہیئے کہ اُسے جو سزا دی گئی ہے وہ کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہے۔ عین عدل و انصاف ہے۔

بچّہ کی تربیت! بچّہ کو تعلیم دینے، اور بچّے کی اصلاح و تربیت کا کام کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ معلّم، احوال طفولیت سے آشنا ہو، بچّہ کی طبیعت، مزاج، زندگی، اور اس کی عقلی استعداد سے پورے طور پر واقف ہو، وہ جانتا ہو کہ مراحل نشوونما کیا ہیں اور ان سے کس طرح گزرنا چاہیئے؛ وہ اس سے بھی باخبر ہو کہ بچّے کس بات کو پسند کرتے ہیں، کیا ناپسند کرتے ہیں، کسی کام کے کرنے کی انھیں ترغیب کس طرح دی جاتی ہے؟ یہ سب باتیں جاننا اس لئے ضروری ہیں کہ بغیر ان کے تمام مدرّس، انھیں صحیح ڈھرّے پر نہیں لگا سکتا، نہ صحیح راستے کی طرف ان کی رہنمائی

کرسکتا ہے ، مدرّسین کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں ، لیکن یہ نہیں جانتے کہ پڑھائیں کیسے ، علم کا حاصل کرنا اور چیز ہے ، اور علم کا سکھانا بالکل دوسری چیز ہے "

کامیاب مدرس! تعلیم بچّگان سے مدرس کو بہت سے امور میں کافی مدد ملتی ہے ، اور خود اُسے کامیاب مدرس بننے کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں ، مثلاً

(۱) وہ یہ جان لیتا ہے کہ تربیت طفولیت کا مقصد کیا ہے ؟

(۲) وہ بچّوں کی سیرت ، مزاج ، اور شخصیت سے آشنا ہو جاتا ہے ، یہ جان لیتا ہے کہ ان کا جسم کیا چاہتا ہے ، اور عقل کیا مانگتی ہے ؟ وہ یہ بھی معلوم کرلیتا ہے کہ بچّے اگر صاف ستھرے ہوں ، اچھی آب و ہوا میں رہ رہے ہوں ، ان کی غذا دیسی ہو ، اور انھیں آرام کا پورا موقع ملتا ہو ، تو ان سے کام لینے میں کتنی آسانی ہوتی ہے ، اس لئے کہ بچّے بھی بہر حال خون اور گوشت کا مجموعہ ہیں ، وہ محسوس بھی کرتے ہیں اور سوچتے بھی ہیں ، ان کے پاس بھی جسم ہے ، اور وہ تربیت کا محتاج ہے ، وہ عقل بھی رکھتے ہیں ، جس سے سمجھنے کا کام لیتے ہیں ، ضروری ہے کہ یہ عقل نا تربیت یافتہ نہ رہنے پائے ، ان کے سینے میں دل بھی موجود ہے ، محبت بھی کرتا ہے ، اور نفرت بھی

کرسکتا ہے، مدرّسین کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ پڑھائیں کیسے، علم کا حاصل کرنا اور چیز ہے، اور علم کا سکھانا بالکل دوسری چیز ہے۔"

کامیاب مدرس!! تعلیم بچّوں سے مدرس کو بہت سے امور میں کافی مدد ملتی ہے، اور خود اُسے کامیاب مدرس بننے کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں، مثلاً

(۱) وہ یہ جان لیتا ہے کہ تربیت طفولیت کا مقصد کیا ہے؟

(۲) وہ بچّوں کی سیرت، مزاج، اور شخصیت سے آشنا ہو جاتا ہے، یہ جان لیتا ہے کہ ان کا جسم کیا چاہتا ہے، اور عقل کیا مانگتی ہے؟ وہ یہ بھی معلوم کرلیتا ہے کہ بچّے اگر صاف ستھرے ہوں، اچھی آب و ہوا میں رہ رہے ہوں، ان کی غذا درست ہو، اور انھیں آرام کا پورا موقع ملتا ہو، تو ان سے کام لینے میں کتنی آسانی ہوتی ہے، اس لئے کہ بچّے بھی بہر حال خون اور گوشت کا مجموعہ ہیں، وہ محسوس بھی کرتے ہیں اور سوچتے بھی ہیں، ان کے پاس بھی جسم ہے، اور وہ تربیت کا محتاج ہے، وہ عقل بھی رکھتے ہیں، جس سے سمجھنے کا کام لیتے ہیں، ضروری ہے کہ یہ عقل نا تربیت یافتہ نہ رہنے پائے، ان کے سینے میں دل بھی موجود ہے، محبت بھی کرتا ہے، اور نفرت بھی

وہ اس سے محبت کرتا ہے، جو ان سے محبت کرے اس سے نفرت کرتا ہے جو ان سے نفرت کرے، جو ان پر اعتماد کرے وہ بھی اعتماد کرنے لگتا ہے، جو ان پر شک کرے، وہ بھی اس سے بھڑکنے لگتا ہے، لہٰذا دل کو بھی تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا، اس کی پاسبانی بھی ضروری ہے؛

(۳) بچوں کی تعلیم ان کی بہت سی خامیوں کو دور کردیتی ہے، ایک دفعہ، ایک مدرّس نے، اپنے ایک شاگرد کو بہت پیٹا، اس لئے کہ جب وہ اس کی تنبیہ کر رہا تھا، تو اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا، درجہ کے دوسرے طلبہ اس کی اس عادت سے واقف تھے، کہ جب اس کی عقل مضطرب ہوتی ہے تو اس کے چہرے پر بیوستہ کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن مدرّس صاحب، اس بات سے ناواقف تھے۔ واقف ہوتے، تو اسے پیٹنے کے بجائے اس کی اصلاح کرتے، کیونکہ بچوں کی اکثر عادتیں بغیر کسی مقصد، اور ارادہ کے ہوتی ہیں،

یہ ہو سکتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق جو تحریری مواد جمع ہے اس سے مدرس فائدہ اٹھائے، اور کام لے، لیکن بہت سے بچوں سے بذاتِ خود سابقہ رکھنا، بچوں کی مختلف عادتوں اور کیفیتوں کا بہ چشم خود بار بار اور ہر روز مشاہدہ کرتا، بچہ کی مکتبی، اور منزلی، حالت کو دیکھتے رہنا، بچوں کو بچگانی کتابیں، اخبارات، اور رسالے پڑھاکر، ان کی ذہنیت سے واقفیت پیدا کرنا،

یہ چیز ہی اور ہے، اس طرح مدرس کے لئے بچّہ کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے، اور اگر ہم، بچّہ کی طبیعت اور مزاج سے نا آشنا رہ کر اسے تعلیم دینا شروع کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کر رہے ہیں اور بچّہ کو بجائے اس کے کہ کچھ فائدہ پہنچے الٹا نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے!

ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم بچّہ پر مسلّط نہ ہوں، اس کی فکر و عقل پر چھاپہ مار کر نہ بیٹھ جائیں، بلکہ خود اسے موقع دیں کہ سوچے اور کرے، بچّہ سے یہ کبھی نہیں کہنا چاہیئے، "یہ کام میں ناپسند کرتا ہوں، لہٰذا تو بھی اسے ناپسند سمجھ، اور نہ کر، اس کے بجائے بچّہ سے کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے اچھائی برائی بتاکر، رائے قائم کرنے، اور خود سے مجتنب رہنے، یا پسند کرنے کا موقع دیا جائے، اس طرح وہ وہی کرے گا، جو آپ چاہتے ہیں لیکن بطور خود ہوکر،

بچّہ کی حیثیت! یہ بہت آسان بات ہے کہ بچّہ کو کسی کام کے کرنے کا حکم دے دیا جائے، یا کسی کام کے کرنے سے اُسے منع کردیا جائے وہ مجبور ہے، آپ کا کہا مان بھی لے گا، لیکن کیا اس طرح وہ نہ کرنے والے کاموں کو ناپسند کرنے لگے گا؟ کرنے والے کاموں کو پسند کرنے لگے گا؟ نہیں، یہ اس وقت ہو سکتا ہے، خود اس کا دل کہے، ہاں، یہ نہیں

کرنا چاہیئے، اور یہ کرنا چاہیئے، بچّہ سے اگر آپ واقعی کوئی کام کرانا یا کسی کام سے روکنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے بہتر اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے قائل کردیں، سمجھا دیں، جب وہ سمجھ لے گا تو آپ کا مقصد بغیر کسی جبر اور دباؤ کے آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائے گا، بچّہ کی طبیعت میں فطرتاً جستجو کا مادّہ ہوتا ہے، وہ اس کھوج میں رہتا ہے یہ کام کیوں نہ کروں؟ اور یہ کام کیوں نہ کروں؟ اگر اسے اصل وجہ اور کنہ معلوم ہو جائے گی، تو بے چون و چرا وہ وہی کرے گا جو آپ چاہتے ہیں، جو اسے کرنا چاہیئے۔

اس سلسلۂ بحث و گفتگو میں ایک مثال کا تذکرہ شاید بے موقع نہ ہو، ایک بچّہ کی عادت تھی کہ جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹتا تھا، تو کمرہ کا بلب روشن رہنے دیتا تھا، اور سونے سے پہلے ماں باپ سے کہانی سُن کر سوجایا کرتا تھا؛ ایک روز اس نے روشنی پر اصرار نہیں کیا، ماں نے چاہا، بلب بجھا دے تاکہ بچّہ کو اطمینان اور آرام سے سونے کی عادت پڑ جائے اور اندھیرے سے ڈرا نہ کرے، لیکن ادھر بجلی کا سوئچ آف ہوا۔ ادھر بچّہ چیخ چیخ کر رونے لگا، ماں بچے کے پاس گئی، اور اس سے کہا، بیٹے، تم چاہتے ہو، تو ہم بجلی جلائے دیتے ہیں، لیکن یہ سوچ لو، اس طرح ہر مہینے تمھارے ابا جان، بجلی کمپنی کو، بہت سے

روپے بھرتے ہیں، اور تمہارے لئے، سائیکل کھلونے، اور دُوسری چیزیں نہیں خرید پاتے۔ بچّہ چُپ ہو گیا، اور ماں سے بتی بجھا دینے کو کہا۔ اور پھر اپنے سونے کے کرہ کو سوتے وقت روشن کرنے کی ضد اس نے کبھی نہیں کی ؛

بچّہ کی تربیت

بچّہ کی تربیت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑے صبر اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑی دور اندیشی اور احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے اور اگر ذرا بھی چُوک ہوئی، تو بچّہ بگڑ جاتا ہے۔ اور بچّہ کے بگڑ جانے کا مطلب یہ ہوا کہ مستقبل کی قوم بگڑ گئی۔ اس لئے کہ یہی بچّہ بڑا ہو کر فرد بنے گا۔ اور انہی افراد کا مجموعہ قوم کے نام سے پُکارا جاتا ہے ؛

بچّوں کی تربیت کے بارے میں مدرسوں اور اُستانیوں سے بسا اوقات بڑی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اور یہ غلطیاں زیادہ تر نتیجہ ہوتی ہیں، بچّوں کی نفسیات سے ناواقفیت کا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنی عمر کے لوگوں کے عادات و اطوار بچّوں میں دیکھیں۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ بچّہ بہر حال بچّہ ہے۔ اس کی پرورش کے خاص اصول ہیں۔ اور انہیں ہر حالت میں پیشِ نظر رہنا چاہئے۔ گھر اور مکتب دونوں جگہ، یہی بنیادی غلطی ہوتی ہے۔ جو سارا کام بگاڑ دیتی ہے۔ اور اس کا ازالہ صرف

اس طرح ہوسکتا ہے ۔ کہ جہاں ہم بچہ کی تعلیم میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کریں ، وہاں اس کی تربیت میں بھی کوئی سقم نہ رہنے دیں ۔

تربیت کی اہمیت

موجودہ زمانہ میں بچہ کی تربیت تعلیم سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہے ۔ بغیر صحیح تربیت کے معلم کچھ بھی سودمند نہیں ہوسکتا ۔ بنیاد و اساس یہی ہے ۔ باقی جو کچھ ہے وہ فروع ۔

ژان ژاک روسو[1] پہلا شخص ہے ۔ جس نے یہ نعرہ بلند کیا کہ بچہ کے لئے سب سے پہلی اور بنیادی چیز تربیت ہے ۔ بغیر اس کے تعلیم مکمل نہیں ہوسکتی اور بچہ کے امیال و عواطف کا اندازہ نہیں ہوسکتا اور تربیت تمام تر ، امیال و عواطف اور مزاج و طبیعت ہی پر منحصر ہے ۔ روسو کی کتاب " امیلی " کو تعلیم اطفال کی " انجیلِ مقدس " کہا جاتا ہے

روسو کی نظر میں کوئی بچہ بُرا نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ گھر بُرا ہوتا ہے جس میں وہ رہتا ہے ۔

---

[1] " Jean-Jacques Rousseah Fenelon " ۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا ۔ ۱۷۷۸ء میں وفات پا گیا ۔ اس کا شمار ائمہ تربیت اور ابطال حریت میں ہوتا ہے ۔ اگر روسو نہ ہوتا تو فرانس انقلاب سے آشنا نہ ہوتا ۔

وہ نمونہ بُرا ہوتا ہے جس کی وہ پیروی کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر زیادتی اور کیا ہوگی۔ کہ قبل اس کے کہ بچہ میں غلطیوں اور خطاؤں کا ادراک پیدا ہو اسے سزا دی جانے لگتی ہے۔ جو تحفہ دیا جاتا ہے اُسے، وہ ہوتا ہے مار پیٹ اور زجر و توبیخ کا، اس کی خواہشوں کو پامال کیا جاتا ہے۔ اس کی رغبتوں کو کچل دیا جاتا ہے۔ ہم خود ہی بچہ کو بگاڑتے ہیں اور خود ہی شکایت کرتے ہیں۔ کہ یہ بگڑ گیا۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ بچہ کے سامنے جو نمونہ ہوگا، وہ اسی کی پیروی کرے گا۔ جو سُنے گا، وہی بولے گا ٭

ہم قدم قدم پر طبیعت کے خلاف چلتے ہیں۔ اور جب اس کا بُرا نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ تو ہم کراہتے اور افسوس کرتے ہیں۔ طبیعت کا تقاضہ یہ ہے۔ کہ بچہ جب تک مرد نہیں بن جاتا اسے بچہ ہی سمجھا جائے۔ اور بچپن کی تعلیم، تدریس، تربیت کا اصول بالکل الگ اور جُداگانہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہوسکتی کہ ہم بچہ کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو پُورے آدمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان سے وہی توقع رکھیں، جو بڑوں سے رکھتے ہیں ہمارا عقیدہ یہ ہے۔ کہ بچہ جب تک بچہ ہے، اسے بچہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ پھر جب وہ پُورا آدمی بن جائے، تب بے شک اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے، جو آدمیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ٭

ایک مقام پر انجیل میں آیا ہے :-
"جب میں بچہ تھا، بچوں کی طرح بولتا تھا، اور بچوں ہی کی طرح سوچتا اور سمجھتا تھا، لیکن جب میں مرد بن گیا تو بچپن کی باتیں بھول گیا۔"

آج کل جو تربیت کا اصول کارفرما ہے وہ درحقیقت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ آج کل کے زمانہ میں بچہ سے یہ امید نہیں کی جاتی کہ وہ مردِ کامل کی طرح بولے گا یا مردِ کامل کی طرح سوچے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم کسی مرد سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ بچہ کی طرح بولے گا، یا بچہ کی طرح سوچے گا۔

قدیم تربیت کا نقص

قدیم اصولِ تربیت میں کئی خامیاں تھیں۔ فنلون[1] نے اپنے زمانہ کے مدرسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا :- "ان مدرسوں میں نہ حریت ہے، نہ مسرت۔ اسباق کا ایک لاتناہی سلسلہ ہے، سکوت کا ایک مسلسل دور ہے۔ تھکا دینے والی نشست کا نہ

[1] "Fenelon" فرانس کا مانا ہوا ادیب، فلسفی اور ماہرِ تعلیم و تربیت، مذہب، فلسفہ، تعلیم، ادب اور تاریخ کے عنوانات پر بیش بہا کتابوں کا مصنف، خطابت، اور فصاحت و بلاغت میں یکتا۔ ۶ اگست ۱۶۵۱ء میں پیدا ہوا۔ ۷ جنوری ۱۷۱۰ء میں وفات پائی۔

نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے اور پھر مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ ہے!" ایک اور معلم کا قول ہے: "ہمارے مدرسوں میں جو بچے ہماری تربیت میں ہیں، دن رات کسی وقت بھی ہم ان کا تعاقب نہیں چھوڑتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی خرابی اور شر پسندی میں دن رات اضافہ ہو رہا ہے!"

مونٹین[1]، ایک دوسرے فرانسیسی ادیب نے اپنے عہد کے مدرسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا: "یہ مدرسے جیل خانے ہیں، مدرسہ میں داخل ہو جیئے تو، اور وہاں سے باہر نکلئے تو آپ دیکھیں گے، طلبہ سبق گھوٹے جا رہے ہیں۔ ان مدرسوں میں سوا لڑکوں کی چیخ پکار کے اور ان کی مار پیٹ کے شور کے اور کچھ نہیں سنائی دے گا۔ یا مدرسین کا ہنگامہ ہوگا، جو غصہ میں بدمست ہوں گے اور ڈانٹ ڈانٹ کر پڑھا رہے ہوں گے ان حضرات کے نزدیک ان معصوم اور مسکین بچوں میں علم کی تشویق پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ڈنڈا ہے!"

یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی تربیت بے نتیجہ رہتی ہے۔ لڑکے مدرسہ اور مدرس سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور مار دھاڑ کے ڈر سے مدرسے میں جو کچھ سیکھتے

---

[1] Montaigne، فرانسیسی ماہر تربیت و تعلیم، ولادت ۱۵۳۳ء، وفات ۱۳ ستمبر ۱۵۹۲ء۔

ہیں، وہ اسے چھوڑتے ہی بھول جاتے ہیں ٭

بچّہ اور مشق بچّہ کے قویٰ، صرف استعمال اور مشق و مزاولت ہی سے نشو و نما پاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کلّیہ ہے، جس میں کوئی استثنا نہیں۔ ہم چلنا صرف اسی طرح سیکھ سکتے ہیں کہ چلنے کی مشق کریں۔ بات کرنا اسی طرح ہمیں آسکتا ہے۔ کہ بار بار بات چیت کریں۔ جس طرح گھوڑے کی سواری، بغیر گھوڑے پر چڑھے ہوئے نہیں آسکتی نہ بغیر تیرے ہوئے تیرنا آسکتا ہے۔ اگر بچپن میں بچّہ کے عقلی قویٰ کی تربیت اور پرداخت اور صحیح استعمال نہ ہو۔ تو پھر یہ کمی آخر وقت تک باقی رہتی ہے۔ بالکل یہی حالات، حواس، شعورِ ادبی اور شعورِ حسابی کے ہیں۔ انہیں بھی صرف استعمال و تمرین ہی سے مستحکم کیا جا سکتا ہے ٭

تربیت دہندہ کا فرض ہے کہ وہ شروع ہی سے ان امور کا لحاظ رکھے۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی حریتِ شخصی سے غلط اور ناجائز فائدہ اُٹھائیں گے۔ بالکل بچپن سے تربیت کے اصولوں پر ہمیں اپنی نظر رکھنی چاہیئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بچّہ کو اتنی فرصت بھی دینی چاہیئے کہ وہ خود بھی اپنی عقل و فکر سے کام لے سکے۔ ہمیں یہ نہیں چاہیئے۔ کہ اسے اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کریں۔ اور ہمارے دماغ سے سوچنے لگے۔ ہماری آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ اور ہمارے کانوں

اس کے منہ کے سامنے کرتی تھی، تو وہ انکار کر دیتا تھا۔ پھر وہ زبردستی اس کا منہ کھول کر جبراً دوا پلا دیتی تھی۔ اس مہمل سے بچہ کو جو فائدہ ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہؤا۔ اور اس کی وجہ جور و استبداد کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ ہم بچہ کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ کریں؟ کیا یہ کھلا ہؤا ظلم نہیں ہے کہ ہم ایسی بیچاری مخلوق پر زبردستی کریں جو رونے کے سوا اپنی کوئی مدافعت نہیں کرسکتی اور جس کا نہ کوئی معین ہے نہ مددگار؟ عاقل وہی ہے جو بچہ کے ساتھ اس کی طبیعت اور مزاج کے موافق سلوک کرے۔ اوپر جو واقعہ مذکور ہوا، گھر اور مکتب میں اکثر و بیشتر اسی طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

اطالیہ کی مشہور ماہر تعلیم و تربیت ڈاکٹر مانٹسوری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں ایک پارک میں گئی۔ وہاں میں نے ایک ہنس مکھ اور چنچل بچہ دیکھا۔ عمر مشکل سے ڈیڑھ سال کی ہوگی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ سنگریزوں سے اپنی جھولی بھر لے۔ اس کے ایک طرف اس کی دایہ کھڑی تھی، ایک اچھی سی چادر اوڑھے ہوئے۔ صاف معلوم ہوتا تھا، یہ اس بچہ کو چاہتی ہے اور اس کی پوری نگہداشت کرتی ہے۔ جب گھر جانے کا وقت آیا، تو اس نے کئی مرتبہ بچہ سے اپنا کام ترک کر دینے کو کہا۔ تاکہ وہ اسے اس کی ننھی سی

گاڑی میں بٹھائے اور لے جائے ۔ لیکن بچّہ نے آیا کی بات کی کچھ بھی پروا نہیں کی ۔ اس نے تمام سنگریزے اُٹھا کر گاڑی میں رکھ دیئے ۔ اسے کامل یقین تھا ۔ اب بچّہ مطمئن ہو جائے گا ۔ لیکن اس نے رونا اور چیخنا شروع کر دیا ۔ گویا وہ اپنی آیا کے کام کو سخت ناپسند کر رہا ہے ۔ اور اسے سخت غصّہ آ رہا ہے ۔

بچّہ کی حالت

اس معاملہ میں آیا سے غلطی کیا ہوئی بچّہ کیوں رویا ؟ حالانکہ وہی کام کیا گیا جو وہ چاہتا تھا ۔ آیا نے یہ نہ سمجھا کہ بچّہ کے رونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ سنگریزے جھولی میں کیوں بھرے گئے ؟ یا گاڑی میں کیوں رکھے گئے ؟ وہ اس لئے رویا کہ آیا نے یہ کام کیوں کیا ؟ خود اسے یہ کام کیوں نہیں کرنے دیا گیا ؟ وہ خود یہ کام کرتا تب ہی اس کا دِل مطمئن ہو سکتا تھا ۔ اور اس کا ارادہ پُورا ہو سکتا تھا ۔ آیا نے یہ مقصد نہیں سمجھا ۔ سطحی طور پر وہ یہی سمجھی کہ بچّہ یہی چاہتا ہے کہ سنگریزے لے لے ۔ چنانچہ اس نے جھولی بھر دی ۔ اور بچّہ بجائے خوش ہونے کے رونے لگا ۔ اگر یہ کام بچّہ ہی پر چھوڑ دیا جاتا ، تو زیادہ اچھّا ہوتا ۔ بچّہ کا مقصد خاص طور پر یہ نہیں تھا کہ سنگریزے اُٹھالے ، بلکہ یہ تھا کہ جو کام وہ کر رہا ہے ، بغیر کسی مداخلت کے اسے کرے ۔ لیکن آیا اس کے اور اس کی طبیعت کے درمیان آکر حائل ہو گئی ۔

یہ اور اس طرح کی دُوسری مثالیں، بچّہ کی صحیح تربیت کے اصول کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ تربیت دہندہ کو یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ بچّہ حرکت اور عمل کو پسند کرتا ہے۔ نشاط کار اور کھیل کود سے اسے دلچسپی ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ اس کے کھیل کود میں شرکت کرو۔ اس کے شعور میں حصّہ لو۔ اسی طرح اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی عقل اور بدن کو پُورے طور پر نشو و نما کا موقع مِل سکتا ہے۔

اور اگر ان بنیادی اصولوں اور حقیقتوں کو نظرانداز کر دیا جائے۔ بچّہ کے امیال و عواطف، رغبت اور طبیعت کو اہمیت نہ دی جائے، تو کام بگڑ جاتا ہے۔ تربیت دہندہ کا فرض ہے کہ وہ بچّہ کو پڑھائے بھی۔ اور بچّہ کو کھلائے بھی، تاکہ اس کا نفس مرنے نہ پائے، اس کا ارادہ ضعیف نہ ہونے پائے۔ اس کی آرزوئیں قتل نہ ہونے پائیں۔ اس لئے کہ اگر یہ ہوا تو دراصل خود بچّہ کی مَوت ہے۔

بچّہ کا شعور

ایک دن ایک باپ اپنے بچّہ کے ساتھ ایک پارک میں گیند کھیل رہا تھا۔ بچّہ جانتا تھا۔ باپ کو کھیل سے زیادہ پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ کھیلتے کھیلتے بچّہ نے دفعتہً پوچھا "ابّا جان کیا آپ تھک گئے؟ ایسا ہے تو بس اجازت دیجئے۔ میں دُوسرے لڑکوں کے ساتھ جاکر کھیلوں۔ میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔

دُوسرے دن یہی لڑکا، مدرسہ آیا اور ایک لڑکے نے اُس کی آنکھ پر مکّا مار دیا۔ وہ سُوج آئی۔ ماں کو یہ خبر ملی۔ تو وہ بےکل ہوگئی۔ اس نے ابھی تک بچّہ کو دیکھا نہیں تھا۔ لیکن اسے وہم ہوُا کہ بچّہ کی آنکھ کو ضرور کچھ نقصان پہنچا ہے۔ یہ خیال اس بُری طرح اس پر مسلّط ہوا کہ وہ زمین پر گِر پڑی اور بیمار ہوگئی۔ وہ لڑکا ہمیشہ اپنے نوکر کو اس بات پر ملامت کرتا تھا۔ جس نے ماں کو یہ خبر پہنچائی تھی کہ اگر تم چُپ رہتے تو یہ واقعہ رونما نہ ہوتا۔ وہ خادم سے جو مدرسہ میں اسے لینے آتا، ماں کی حالت پوچھتا، اور گھر پہنچتا تو ماں کو دِلاسہ دیتا کہ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا، میں بالکل اچھا ہوں ٭

اِن مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بچّہ میں بھی سمجھ ہوتی ہے۔ اس میں بھی ذمّہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ کی نوعیت سمجھنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہے ٭

بچّہ کے سوالات

بچّہ بہت سے سوالات کرتا ہے ہمارا فرض ہے کہ اس کے سوالوں کو ٹالیں نہیں۔ بلکہ اسے شافی اور کافی جواب دیں۔ اور اس کی تسلّی کر دیں۔ اگر وہ مذہب کے بارے میں، جنگ کے بارے میں، قتل کے بارے میں پُوچھتا ہے۔ یا یہ دریافت کرتا ہے وہ کیسے پیدا ہوُا؟ تو اس کے ہر سوال کا نہایت واضح اور

تسلی بخش جواب دینا چاہیئے - یہ کبھی نہیں کہنا چاہیئے کہ "تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے، بلکہ ہمارا فرض ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ اسے سمجھا سکتے ہیں، سمجھا دیں - جتنا زیادہ سے زیادہ اسے مطمئن کر سکتے ہیں کر دیں - آج ممکن ہے وہ پورے طور پر نہ سمجھ سکے - لیکن سوال و جواب سے اس میں مناسبت تو پیدا ہو جائے گی - کل جب یہ مسئلہ اس کے سامنے آئے گا - تو وہ ضرور آسانی کے ساتھ اسے اپنی گرفت میں لے لے گا ٭

بچہ کا جذبۂ کار

بچہ کام کرنے کے لئے بیچین رہتا ہے - لیکن اسے ایک معاون کی ضرورت رہتی ہے - جو گھر میں اور مدرسہ میں اس کی مدد کر سکے - یہ بہت بڑی بھول ہے - کہ ناسمجھی اور لاشعوری کی حالت میں بچہ کو تنہا چھوڑ دیا جائے - وہ اگر پیاسا ہوگا، تو پانی کے بدلے زہر بھی پی سکتا ہے - اس لئے کہ وہ پانی اور زہر کا فرق نہیں جانتا - وہ خود کچھ نہیں جانتا - دوسروں کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتا ہے وہی سیکھ لیتا ہے - وہ سیکھنے اور معلوم کرنے کی طرف متوجہ رہتا ہے - وہ طرح طرح کے سوالات کرتا رہتا ہے کہ اپنی معلومات میں اضافہ کرے - یہ کیوں ہوا؟ کب ہوا؟ یہ چیز کہاں سے لائے؟ اس کی کیا قیمت ہے؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالات کرتا رہتا ہے

ان تمام سوالات کا شافی جواب بچّہ کو ملنا چاہیئے۔ بچّہ کے سوالات کا جواب دینے سے اس لئے انکار نہیں کر دینا چاہیئے کہ ابھی یہ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ نہ یہ سوچنا چاہیئے کہ اسے قدم قدم چلایا جائے یہاں تک کہ یہ سیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ جو بچّہ معلوم کرنا چاہتا ہے اور اُسے نہیں بتایا جاتا، وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتا ہے۔ اس کے سمجھدار ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ جو پُوچھے بتا دینا چاہیئے۔ مدرّس کی ایک بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ تربیت کے بارے میں اس کا کیسۂ معلومات بہت مختصر ہوتا ہے۔ اس فن کی کتابیں وہ نہیں پڑھتا۔ اور جو کچھ تھوڑا بہت پڑھتا ہے اس پر عمل کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔

بچپن کی مصیبت

آدمی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہر وہ چیز جو اس کے جی میں آئے کر ڈالے۔ اس لئے کہ اجتماعی قواعد کبھی کبھی اس کے اور اس کے ارادوں کے مابین حائل ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسے حفظانِ صحت کے قواعد کہ بعض وقت رغبت کے باوجود کھانے سے عارج ہوتے ہیں۔

بچّہ، امر و نہی، ہر معاملہ میں مجبور ہے۔ کبھی اسے ایسے کام کا حکم دیا جاتا ہے جسے وہ سخت ناپسند کرتا ہے اور کبھی ایسے کام سے منع کیا جاتا

ہے جو اسے بہت پسند ہوتا ہے۔ اس کے ارادہ اور رغبت کو اپنی جگہ بنانے کا موقع نہیں ملتا۔ مجبوری اسے ہر چہار طرف سے گھیرے رہتی ہے۔ گھر میں بھی وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ اور مدرسہ میں بھی اس کے ہاتھ پاؤں بندھے رہتے ہیں۔ وہ ایک کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ماں، باپ، بھائی، بہن کی فوج مخالفت کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگر مدرسہ میں اس کی طبیعت کچھ اُمنگ دکھاتی ہے تو مدرس یا ساتھی منع کر دیتے ہیں۔ وہ ایک عجیب مخمصہ میں اپنے تئیں گرفتار پاتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ہر وقت اس کی نگرانی ہوتی ہو۔ بلکہ یہ بھی کہ اسے بار بار جھڑکا بھی جاتا ہے، مارا بھی جاتا ہے، منع بھی کیا جاتا ہے۔ اب آخر وہ کیا کرے؟ قدرتاً وہ اس صورتِ حال سے گلو خلاصی چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کوئی ایسی جگہ ملے۔ جہاں وہ اطمینان سے سوچ سکے۔ آزادی سے اپنے ارادے پورے کر سکے۔ کیونکہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے نہیں کر پاتا۔ جو نہیں کرنا چاہتا اس کے کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

بچہ کا احتجاج

بچہ اسے کبھی بھی پسند نہیں کرتا کہ ہر وقت وہ قید و بند میں رہے اور کوئی کام بھی آزادانہ نہ کر سکے۔ چنانچہ کبھی کبھی تو وہ اپنے احتجاج کا اظہار رو رو کر کرتا ہے، اور کبھی جل کر، اور کڑھ کر بچہ دوسروں کے مقابلہ میں

بہت زیادہ نازک احساسات کا مالک ہوتا ہے۔ اس کا
تاثر بڑا تیز ہوتا ہے۔ بچّہ کے ساتھ ہمیشہ نرمی،
اور ملاطفت کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اور جب اسے کسی
کام سے منع کیا جائے تو اس کی وجہ سمجھا دی جائے
کسی کام کی ترغیب دی جائے تو اس کے اسباب بتا
دیئے جائیں۔ ایسا امر، اور ایسی نہی، جس کے ساتھ
اسباب کا ضمیمہ نہ ہو، بے اثر بھی ہے اور مُضر بھی
بچّہ کو ایک قِسم کی ضِد سی ہو جاتی ہے اسے اگر منع
کرد، تو وہ ضرور کرے گا۔ اس کی اس ضد کا مقصد
یہ ہوتا ہے۔ کہ اس حکم، اور نہی کی خلاف ورزی کا
نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ اگر اسے پہلے سے سمجھا دیا جائے۔ تو
وہ آسانی سے مان جائے گا۔ اور وہی کرے گا۔ جو کام
ہم اس سے لینا چاہتے ہیں ؂

حقیقت کس طرح دریافت کرلے ؟ ایک نیا نظریہ کیونکر تراش لے ؟

بچّہ اور کھیل

کھیل کھیل میں بچّہ کو بہت سی ایسی چیزیں معلوم ہو جاتی ہیں، جو اس کے فہم و ادراک میں اضافہ کرتی ہیں اور اس کی واقفیت بڑھاتی ہیں۔ بچّہ جب سال بھر کا ہو جاتا ہے تو آوازیں نکالنے لگتا ہے۔ پھر ان آوازوں سے وہ کلمات بنا لیتا ہے، اور باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو گیند کے پھینکنے میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ پھر اس کی طبیعت حرکت کی طرف مائل ہوتی ہے اور وہ کھیل سے دلچسپی لینے لگتا ہے اس طرح اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں، ہاتھ اور انگلیاں طاقت پکڑنے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ کپڑے پھاڑ دیتا ہے، محض کھیل کھیل میں، اور کھیلتے کھیلتے زمین بھی کھودنے لگتا ہے ؛

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن پر ہمیں نہ افسوس کرنا چاہیئے نہ پریشان ہونا چاہیئے۔ یہ تو بچپن کے لوازم ہیں، اور ان سے کسی طرح بھی مفر نہیں۔ بلکہ میں تو ان لوازمات کو جمالِ طفلی سمجھتا ہوں۔ بچّہ کا حُسن یہی ہے کہ وہ اُچھلے کُودے، شرارت کرے، توڑے پھوڑے اور گھر میں ایک ہنگامہ مچا دے۔ صرف اسی طرح بچّہ کی مہارت بڑھ سکتی ہے۔ اور اسے نئی نئی معرفتیں حاصل ہو سکتی ہیں ؛

بچّہ، ماں باپ سے اپنے کاموں میں مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیادہ مگن ہوتا ہے تو بڑے بھائی کے کاندھے پر بھی چڑھ کر سواری کرتا ہے۔ یا دروازوں، اور دیواروں پر بے معنی لکیریں کھینچتا ہے۔ لیکن ان باتوں پر ہم اسے جھڑک دیتے ہیں۔ حالانکہ ملامت کا وہ نہیں، ہم خود مستحق ہیں۔ اگر اس کے لئے چوبی گھوڑا مہیّا کر دیا جائے، جس پر وہ سوار ہو، یا تختی لا دی جائے، جس پر وہ ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں کھینچے، تو وہ کبھی خیال بھی نہیں کرے گا کہ بھائی کے کاندھے کی سواری کرے، یا دیواروں اور دروازوں کو اپنا تختۂ مشق بنائے۔ ہم اگر معلّم یا اُستانی ہیں۔ تو ہم اُسی وقت خوش ہوں گے جب ہمارے زیرِ تربیت بچّے چُپ چاپ اور خاموش بیٹھے ہوں۔ نہ حرکت کریں، نہ باتیں کریں۔ دِن رات ان کے کپڑے بالکل صاف شفاف رہیں۔ ذرا بھی میلے نہ ہوں۔ ہمیں اگر اپنا کام ٹھیک طرح سے کرنا ہے۔ تو ہمیں اپنی اُفتادِ مزاج بدلنی پڑے گی۔ اور بچّوں سے محال کام کی توقّع نہیں کرنی ہوگی۔ نہ یہ چاہنا ہوگا۔ کہ وہ اپنی طبیعت اور فطرت کے خلاف چلیں۔ یہ تمام باتیں ان کے بس سے باہر ہیں ٭

بچّہ کی نگرانی

اکثر ابّا بچّہ کی نگرانی اور نگہداشت اسی وقت کرتے ہیں جب وہ کھیل رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے

بچّوں کو کھیل پر اُکسائیں ۔ کیونکہ تربیت کی تمام قسموں کے لئے کھیل سے دلچسپی لینا بہت ضروری ہے ۔ اور اس زمانہ میں تو بہت سے تعلیمی کھیل بھی ایجاد ہو گئے ہیں ۔ یہ بچّہ کی طبیعت اور مزاج سے پُوری مناسبت رکھتے ہیں ۔ ایسے کھیل بھی ہیں ، جو بچّہ کو عادت بنانا سکھاتے ہیں ، یا سائیکل کی تیّاری کا طریقہ بتاتے ہیں ۔ یا چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز بنانے کی ترکیب سکھاتے ہیں ۔ ان کھیلوں کے ذریعے بڑھئی کا کام ، نقاشی ، تصویر بنانا ، سب ہی کچھ آ جاتا ہے ۔

دُوسرے علمائے نفس و تربیت کی طرح روسو کی بھی نصیحت یہ ہے کہ تربیت و تعلیم کے دَوران میں بچّہ کو آنکھ اور ہاتھ سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیئے ۔ اور کھیل کھیل میں اسے تعلیم دینا چاہیئے ۔ کوئی دانش مند بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ کھیل اور ہاتھ سے کرنے والے کام ، بچّہ کی تربیت عقل و فکر میں بہت زیادہ مددگار ہوتے ہیں ۔ اس طرح بچّوں میں ابداع و اختراع کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ ہمارا فرض ہے ۔ کہ ہم اپنے بچّوں کو تکوینی کھیلوں کی طرف راغب کریں ۔ تاکہ وہ اپنے حواس اور ہاتھ سے کام لینے کی استعداد پیدا کر سکیں ۔

طفولیت کے دو مرحلے

فردیت ——— اور ——— اجتماعیت!

زندگی کے ادوار میں سب سے اہم دور بچپن کا ہے۔ اس دور میں بچّہ کی تربیت پر دو اطراف سے اثر پڑتا ہے :-

(۱) فردیت

(۲) اجتماعیت۔

گھر اور مدرسہ اگر ہم گھر اور مدرسہ میں بچّہ پر پوری توجہ کریں تو وہ صاف ستھرا رہنے کا عادی ہو جائے گا۔ اس کی عقل استوار ہو جائے گی اس کی زندگی بڑی اچھی طرح گزرے گی۔ اس کا جسم توانا ہو جائے گا۔ اس کی صحت اچھی ہو جائے گی۔ کوتاہیاں بہت کم رہ جائیں گی۔ اور بچّہ بڑی حد تک اپنی زندگی سنوار سکے گا۔ اور اگر یہ بچپن کی تربیت ناقص رہ گئی، تو اس اہمال کا بہت بُرا اثر بچّہ کے مستقبل اور سوسائٹی کے حال پر پڑے گا۔

انگلستان میں کوئی بچّہ جاہل نہیں رہنے پاتا۔ اسے اپنی مناسبتِ طبع کے لحاظ سے ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہے۔ یہ ایک انسانی حق ہے جس سے

وہ بہرہ ور ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انسان کا ایک حق زندہ رہنا بھی ہے، کسی کو حق نہیں ہے کہ کسی دُوسرے کی زندگی پر تعدّی کرے۔ یا اس کی ملکیت پر قبضہ کرے، یا اس کی آزادی پر حملہ آور ہو۔ یا کسی کو غلام بنا لے۔ اسی طرح تعلیم بھی اپنے حقوق کی ایک فہرست رکھتا ہے۔ تعلیم کا شمار انسان کے لئے ضروریاتِ زندگی میں سے ہے جیسے پانی، غذا اور ہوا۔ گذشتہ جنگِ عظیم نے یورپ اور امریکہ کو تعلیم کی طرف اور زیادہ متوجہ کر دیا ہے۔ ہر قوم اسی سعی میں سرگرداں ہے کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ استوار اور راسخ کرے۔ تاکہ نئی نسل تربیت اور تہذیبِ کامل کی حامل ہو۔ اس لئے کہ اقوامِ متمدنہ کا یہ اعتقاد ہے کہ ترقی کا واحد وسیلہ صرف تعلیم ہی ہے۔ چنانچہ ان کا ہر فرد تعلیم کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے کہ تعلیم کا فردی اور اجتماعی زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ روم کے مشہورِ زمانہ خطیب اور اور فلسفی سسرو[1] کا قول ہے کہ:- "بچپن کے ابتدائی مرحلوں ہی سے تربیت کا کام شروع ہو جانا چاہیئے!"

---

[1] (Cicero) :- ۱۰۶ ق۔م میں ولادت ہوئی اور ۴۳ ق۔م میں وفات پائی۔ بہت بڑا فلسفی اور بہت بڑا خطیب تھا۔ جسمانی سزا اور بچّہ کی تربیت سے متعلق اس کی رائے بڑی قیمتی مانی جاتی ہے۔

تعلیم کی عمومیّت

انگلستان کے مجرموں کے اعداد و شمار پر ایک نظر اگر ڈالی جائے کہ تعلیم کی عمومیت سے پہلے کتنے زیادہ تھے اور بعد میں کتنے کم رہ گئے تو معلوم ہوگا کہ اقوام اور ملل کی ذہنیت اور طینت پر تعلیم کا کتنا گہرا اور دُور رس اثر پڑتا ہے۔ پھر وکٹر ہیگو کے اس قول کی صداقت کا اندازہ ہوگا کہ: "جس نے مدرسہ کا دروازہ کھولا اس نے جیل خانہ کا دروازہ بند کر دیا!" واقعہ یہ ہے۔ کہ جیل کا دروازہ تعلیم ہی بند کرسکتی ہے۔ فرد اور سماج کی وہی اصلاح کر سکتی ہے۔ قوموں کی بڑائی کا یہی راز ہے۔ افلاطون کا قول ہے: "تعلیم وہ بہترین چیز ہے جس کا کوئی اچھّا آدمی مالک ہوتا ہے!" مونٹین کا قول ہے کہ "جہل تمام رذائل کا سرچشمہ ہے!" فلر[1] کا قول ہے "تعلیم سے بہتر کوئی چیز نہیں!" واقعہ یہ ہے کہ جہل کی زندگی موت کی زندگی ہے۔ انسان علم کا محتاج ہے، کیونکہ علم ہی زندگی کا بہترین وسیلہ ہے!

---

[1] Thomas Fuller (۱۶۰۸ء - ۱۶۶۱ء)

حُسنِ معاملت اور مساوات

اپنے بچوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ ان کے معاملات میں پورے عدل سے کام لو۔ محبت اور شفقت کا حصّہ سب کو برابر دو۔ چھوٹے اور بڑے کی تمیز ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ اکثر علمائے نفس کا خیال ہے کہ "اگر بچّہ اور باپ کے ارادہ میں ٹکرّ ہو، تو باپ کے لئے مناسب یہ ہے کہ یا تو چشم پوشی سے کام لے، یا وہ کام ترک کردے۔" ذیل میں ہم ایک حکایت بیان کرتے ہیں، جس سے بچّہ کے شعور اور والدین کی طرف سے احتیاط و دُور اندیشی کے مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے:

ایک مثال

"علم النفس کے ایک مشہور عالم کا ایک بچّہ تھا۔ عمر کوئی تین سال کے قریب بڑا پیارا بچّہ تھا۔ اور بڑی اچھی عادتوں والا ایک رات اس نے اپنی عادت کے بالکل برخلاف، رات کو سونے سے پہلے حمام میں جانے سے انکار کردیا۔ ماں نے خیال کیا تھکا ہوا ہے، آلکسی کے مارے کپڑے نہیں اتارنا چاہتا۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے اس کے کپڑے اتارنے لگی۔ لیکن ماں نے دیکھا صاحبزادے بہت رنجور ہیں۔ دونوں ہاتھوں کی پوری

قوت سے کپڑے پکڑے ہوئے ہیں، کسی طرح نہیں اُتارنے دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ بچّہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہے۔ اور کسی طرح بھی کپڑے نہیں اُتارنے دے گا۔ ماں نے ضد نہیں کی۔ بچّہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا، اور کہا، اچھّا چلو بستر پر سو رہو نہیں نہاتے نہ سہی، لیکن وہ پھر مچل گیا۔ میرے جو کپڑے تم اُتار چکی ہو، جب تک انہیں نہ پہن لوں، سونے بھی نہیں جاؤں گا۔ ماں نے کپڑے پہنا دیئے۔ کپڑے پہنتے ہی چہرہ کھل گیا اور مسرّت کھیلنے لگی۔ نہ رونا، نہ غصّہ۔ ماں نے پوچھا، بیٹے، تم نے حمام کیوں نہیں کیا؟ فرمایا "امّی چلو، میں حمام کروں گا!" چنانچہ ماں کی انگلی پکڑ کے حمام پہنچے۔ خوب ٹھاٹھ سے نہائے۔ اور پھر آکر بستر پر دراز ہو گئے ۔

ماں اور باپ

ماں اور باپ دونوں کو بچّہ کی اس روش پر سخت حیرت ہوئی۔ جب بچّہ سو گیا، تو باپ کو یاد آیا۔ کل رات کو اس سے بڑے بچّہ نے حمام جانے سے انکار کر دیا تھا، اور بغیر حمام کے سو گیا تھا۔ چھوٹے صاحبزادے نے سوچا میں کیوں نہ اپنی شخصیت کا مظاہرہ کروں چنانچہ مچل گئے۔ بڑے بچّے کو ماں نے اس لئے گذشتہ رات کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ سدا سے ہٹّی تھا۔ یہ چھوٹا اور فرماں بردار تھا۔ لہٰذا ماں نے شروع میں

اس پر سختی کرنی چاہی - بچہ کو یہ فرق ناگوار ہوا۔ اور اس نے اپنی جان پر بنالی - وہ در اصل اس بات پر نہیں چیں رہا تھا کہ حمام نہیں جائے گا - بلکہ وہ اپنے حقوق کے لئے لڑ رہا تھا - اس کے اور اس کے بڑے بھائی کے ساتھ یکساں برتاؤ کیوں نہیں کیا جاتا ؟

اکثر گھروں میں اس اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا - لیکن یہ بہت ضروری بات ہے کہ ایک بچہ کو جو آزادی ہو، وہی دوسرے کو بھی حاصل ہو - تاکہ کبھی بچہ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اس کے ساتھ مساوات اور عدل کا برتاؤ نہیں کیا جاتا - اوپر کی مثال میں اگر ماں بچہ کی یہ واجبی سند پوری نہ کرتی تو ہمیشہ اس کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہتی کہ بڑے بھائی کے مقابلہ میں اس پر ظلم ہوتا ہے۔ اور قیامت تک وہ حمام پر راضی نہ ہوتا - اس کا رنج اور صدمہ بڑھتا جاتا - چنانچہ سونے کے بعد بچہ حمام والا غصہ بھول بھی گیا - لیکن اگر زبردستی اسے نہلایا جاتا تو اس حادثہ کو وہ کبھی بھی نہ بھولتا - انسان کی یہ سرشت ہے - کہ وہ بہت سی چیزیں اور باتیں بھول جاتا ہے - لیکن اگر اس پر ظلم و زیادتی ہوئی تو وہ اسے کبھی نہیں بھولتا ؛

بدسلوکی اور عدم مساوات

اور یہ بدسلوکی اور عدم مساوات کا احساس صرف

بچوں ہی کو نہیں ہوتا - بلکہ پختہ عمر کے آدمیوں میں بھی ہوتا ہے - آپ اکثر لوگوں کی زبان سے سُنتے ہوں گے - ہم تو بڑے اچھے معاملہ کے ہیں لیکن دُوسرے نہیں ہیں - بلکہ وہ حُسنِ معاملت کے جواب میں بدسلوکی کرتے ہیں ؛

اس دُنیا میں بچوں کو بڑی بڑی کٹھنائیاں سہنا پڑتی ہیں - ممکن نہیں کہ سوتیلی ماں کے زیرِ سایہ بچہ وہی صبر و طبیعت پا سکے جس کا اپنی مرحوم ماں کے زمانہ میں خُوگر تھا - جو ظُلم سوتیلی ماں بچہ پر کرتی ہے اسے وہ کبھی نہیں بھُولتا، ہمیشہ یاد رکھتا ہے - کیونکہ اس کی سوتیلی ماں ہمیشہ اس کی شکایتیں کیا کرتی تھی - اُسے مارا پیٹا کرتی تھی - اسے جھڑکیاں دیتی اور گالم گلوچ کرتی رہتی تھی - اس سے محبت نہیں کرتی تھی - اُسے تکلیف دیتی تھی - وہ یہ سارے جور برداشت کرتا تھا، اور کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں تھا - کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سگی ماں بڑے بچہ کے مقابلہ میں چھوٹے بچہ کو زیادہ چاہنے لگتی ہے - اب بڑے بچہ پر رنج کے دَورے پڑتے ہیں اور وُہ اپنے تئیں مظلوم سمجھنے لگتا ہے ، اور یہ ظلم اسے زندگی کے ہر دَور میں یاد رہتا ہے - روسو کا قول ہے "میں جب کبھی ظلم یا مظلوم کا ذِکر سُنتا ہوں ، بس بڑا دُکھ ہوتا ہے - کیونکہ بچپن میں ایک بار مدرسہ میں مجھ پر ظلم کیا گیا تھا - مجھ پر ایک پیالہ توڑنے کا الزام

لگایا تھا، جسے میں نے نہیں توڑا تھا۔ اور ایک ایسے جُرم کی شدید سزا مجھے دی گئی تھی، جو ہرگز مجھ سے سرزد نہیں ہوا تھا!" دُنیا میں ایسے ایسے مظلوموں کی تعداد کتنی زیادہ ہے؟

یکساں برتاؤ! بہر حال والدین یا تربیت دہندہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بچّوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔ ہر بچّہ اس کی نظر میں یکساں ہو۔ تربیت دہندہ میں ماں، باپ، بھائی، اُستاد، مدرسہ سب ہی شامل ہیں۔ تربیت دہندہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ناکردہ گناہ کو سزا نہ دے۔ نہ ایک آدمی کی سزا پُوری جماعت کو دے۔ نہ کسی بچّہ سے انتقام لے۔ نہ کسی ایسے بچّہ کو بُرا سمجھے جو کسی ایسے آدمی کا عزیز ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا۔ اپنے ہر کام اور اقدام میں عدل و مساوات کو ہر وقت ملحوظ رکھے۔ کسی دُوسرے کا گناہ ہو، اور کوئی دُوسرا پٹ جائے ایسا بھی نہ ہونا چاہیئے ٭

پہنچ جاتے ہیں، بچّہ ایسی تعلیل و توجیہ کر سکے گا جسے نتیجہ سے مطلق کوئی تعلّق نہیں۔ کبھی ایک بچّہ اپنی ماں سے اس پر جھگڑ سکتا ہے کہ دودھ اِس لئے سفید ہوتا ہے کہ گائے سفید رنگ کی ہوتی ہے اور دُوسرے دن وہ یہ رائے قائم کرلے گا۔ دودھ ٹھنڈا ہے اور گائے بھی ٹھنڈی ہوگی۔ اس قِسم کی تعلیلیں اور توجیہیں مضحکہ خیز ضرور ہیں۔ لیکن ان سے یہ بھی اندازہ ہوسکے گا کہ بچّہ کا ادراک اسباب کی تلاش میں کیسی کیسی جستجو کرتا ہے۔ اب یہیں سے تربیت دہندہ کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ادراک کی اصلاح کرے۔ اور صحیح اسباب کی تلاش میں بچّہ کو لگا دے۔ اور اس کی غلطی اس پر ملائمت سے واضح کردے ؛

قوّتِ توجیہ کی تربیت

بچّوں کی قوّتِ توجیہ و تعلیل کوئی مشکل کام نہیں ہے اسے آسانی کے ساتھ انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ قوّتِ حکم کی بھی تربیت ہونی چاہئیے۔ یعنی بچّہ جو حکم لگائے وہ غلط اور مہمل نہ ہو۔ بچّہ جن چیزوں میں گھرا ہوتا ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر طرح طرح کے سوالات کرتا ہے۔ ماں باپ جواب نہیں دیتے۔ سوچتے ہیں۔ صرف پریشان کرنے کے لئے ؛ یہ سوال کررہا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے بچّہ کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ جستجو کرے۔ اب اگر

اسے صحیح اطلاع دی جائے ۔ ٹھیک باتیں بتائی جائیں تو نہ وہ حکم لگانے میں غلطی کرے گا ، نہ اسباب غلط بتائے گا ۔

بچوں کا مقصد کثرتِ سوال سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آبا کو خواہ مخواہ پریشان کریں ۔ وہ یہ سوالات اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں فہم اور معرفت کی طرف رغبت ہوتی ہے ۔ جان لاک ، مشہور انگریز ماہرِ تربیت کا قول ہے : " بچہ کا رجحان زیادہ سے زیادہ سوال کرنے کی طرف بڑھاؤ ۔ جہاں تک ہو سکے اس کی رغبت کو ٹھیک کرو ! "

ہم معلمین اور آبا کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ بچوں کو زیادہ پوچھ گچھ پر مائل کریں ۔ اور ان کے سوالات کے شافی اور کافی جواب دیں ۔ تاکہ بچے خود ہی صحیح بنیادوں پر اسباب تلاش کرنے لگیں اور نتائج تک پہنچنے لگیں ، اور حکم لگانے میں غلطی نہ کریں ۔ ان کی توجیہ و تعلیل بالکل ٹھیک ہو ۔ پھر ان کی ذہانت و ذکاوت سُست نہیں پڑے گی اور ہمیشہ وہ علم و معرفت کے اسباب کے لئے دوسروں ہی کا مُنہ نہیں تکا کریں گے ۔

بعض وقت بچوں کے سوالات واقعی بے تُکے ہوتے ہیں ۔ اور ان کا جواب دینا درحقیقت بہت مشکل ہوتا ہے ۔ مثلاً ایک بچہ پُوری سادگی سے پُوچھ بیٹھے گا " آسمان نیلا کیوں ہے ؟ ـــ " سمندر کا پانی

نیلگوں کیوں ہے ؟ " ـــــ " درخت ہلتے کیوں ہیں اور ریل چلتی کیوں ہے ؟ " ـــــ " سوئچ دبانے سے بجلی کا بلب کیسے روشن ہو جاتا ہے ؟ " ـــــ " چاند کبھی چھوٹا اور کبھی بڑا کیوں ہوتا ہے ؟ " ـــــ انسان پیدا کیسے ہوتا ہے ؟ " لیکن ان بے تکے سوالوں کا بھی اس طرح جواب دیا جا سکتا ہے کہ بچہ کی حسِ علم کو صدمہ نہ پہنچے اور اس کے علم میں کسی نہ کسی حد تک اضافہ ہو جائے ۔

حکایت ہم ایک حکایت بیان کریں گے : " ایک دفعہ کوئی چار برس کی بچی نے اپنے فلسفیانہ سوالات سے ماں کو پریشان کر دیا ۔ بچی نے روشندان کے شیشے پر ایک شہد کی مکھی بیٹھی دیکھی ۔ اس نے چاہا کہ مکھی کو پکڑ لے ۔ ماں نے منع کیا " خبردار ڈنک مار دے گی ! " بچی نے فوراً پوچھا ۔ " امی یہ شیشہ کیوں نہیں ڈنک مارتا ، اسے تو ہم روز چھوتے ہیں ؟ " ماں نے کہا ۔ " اس لئے کہ شیشہ اعصاب نہیں رکھتا ۔ " بچی بھلا کیوں چپ رہتی ، پوچھنے لگی " اعصاب کیا ؟ " ننھے بچے بہت سے ایسی باتیں پوچھتے ہیں ، جنہیں وہ سمجھ بھی نہیں سکتے ۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ۔ کہ ان سوالات کی رَو میں انہیں کام کی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں ۔

جارج ایلیٹ[1] مشہور انگریز خاتون لکھتی ہے: "اگر ہر بات کی دلیل و برہان تم نے بچّہ کو بتا دی تو اسے ناکارہ کر دیا!" ان الفاظ سے اس کا مقصد یہ ہے کہ بہت سی دقیق اور نازک باتیں بچّہ پوچھ بیٹھتا ہے۔ ان پر تقریر کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ ایسا جواب دیا جائے جو بچّہ کے ذہن اور عمر سے مناسبت رکھتا ہو ؛

بچّہ اور آدمی میں فرق

غور و فکر، ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جو خدا نے اپنے بندوں کو عطا کی ہے۔ جس طرح پختہ عمر کا آدمی سوچتا ہے، اسی طرح ننھی سی عمر کا بچّہ بھی سوچتا ہے لیکن ان دونوں کی تفکیر میں فرق جو کچھ ہے وہ درجہ طریقہ اور تربیت کا ہے۔ ایک اچھی عمر کے آدمی کی فکر منظم اور مرتّب ہوگی۔ بچّہ کی فکر سطحی،

---

[1] "George Iliot" : — ۱۸۱۹ ۱۸۸۰ انگلستان کی مشہور ادیبہ اور عالمہ بہت سی کتابوں کی مصنّفہ ایف پر اس نے بہت کچھ لکھا ہے۔ جیسے ڈکنس Dickens نے ناداروں کی زندگی پر اور ٹھیکرے Thackray نے انگلش سوسائٹی کے مالدار طبقہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جارج ایلیٹ نے چالیس برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ اس کے طرزِ تحریر میں حُزن و الم کا رنگ غالب رہتا تھا۔